سلسلۂ سلطانیہ

ھو الاوّل

تاریخ البشر

یعنی

کیفیّتِ آغازِ نوعِ انسان حسب تحقیقاتِ جدید

ترجمۂ

تاریخِ عالم حصّہ اوّل

مصنّفہ پروفیسر رڈپاتھ آف امریکہ

از

مفتی محمد انوار الحق ایم۔ اے منشی فاضل

انڈر چیف سکرٹری و سکرٹری صیغۂ تعلیم

دار الاقبال بھوپال

سنہ ۱۹۱۰ء

اوّل

تعداد جلد ۱۰۰۰

قیمت فی جلد مجلد عـــہ غیر مجلد ۸؍ عـــہ

Marfat.com

135841

Marfat.com

نذر

ذخیرہ

اس مختصر سی کتاب کو

اپنی ولیہ نعمت

علیا حضرت والا شوکت بلقیس مرتبت برجیس منزلت سلیمان جاہ

سکندر پایگاہ جناب **نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ**

جی سی ایس آئی جی سی آئی ای فرمانروائے دارالاقبال بھوپال

خلد اللہ ملکہا الی یوم المآل کے نام نامی و اسم سامی

معنون کرنے میں میرے لئے اس کے سوا کوئی عذر نہیں ہے کہ اگرچہ

شایاں نہ بود قطرہ بعمّاں بردن
خار و خس صحرا بگلستاں بردن
امّا چہ تواں کرد کہ رسم است ز مور
پائے ملخے بپیش سلیماں بردن

خاکسار مترجم

Marfat.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان باب	نمبر صفحہ
۱	دیباچہ کتاب	۱ لغایت ۱۹
۲	باب اول - بدو نوع انسان کی بابت چند سوالات ..	۱ لغایت ۱۸
۳	" دوم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم ہیئت کی تحقیق	۱۸ لغایت ۴۳
۴	" سوم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم طبقات الارض کی رائے	۴۴ لغایت ۵۹
۵	" چہارم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم آثار قدیمہ کی رائے	۶۰ لغایت ۷۵
۶	" پنجم " " علم انتھروپالوجی کی رائے	۷۵ لغایت ۸۹
۷	" ششم " " تاریخ و قصص کی رائے	۹۰ لغایت ۱۰۰
۸	" ہفتم " " علم السنین کی رائے	۱۰۱ لغایت ۱۰۹
۹	" ہشتم - جنت کی تلاش	۱۰۹ لغایت ۱۱۶
۱۰	" نہم - اصلی وطن	۱۱۶ لغایت ۱۴۲
۱۱	" یازدہم - نئے مسئلے کی ابتدا	۱۴۲ لغایت ۱۵۴
۱۲	" دوازدہم - مسئلۂ ارتقا	۱۵۴ لغایت ۱۶۹
۱۳	" سیزدہم - مسئلۂ ارتقا کی چند مثالیں	۱۶۹ لغایت ۱۸۳
۱۴	" چہاردہم " " پر چند اعتراض اور اس کے جواب	۱۸۳ لغایت ۱۹۳
۱۵	ضمیمہ کتاب ہذا	۱۹۴ لغایت ۲۰۱

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

اے نامِ دلکشائے تو عنوانِ کار ہا　　خاکِ درِ تو آبِ رخِ اعتبار ہا
از بہرِ خواندنِ رقمِ قدرتت بہار　　اوراقِ گل شمردہ بانگشتِ خار ہا

حمد و نعت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر طور پر اس کتاب کی ہیئت۔ اور اس کے ترجمے کی کیفیت بیان کر دی جائے۔ تاکہ وہ مضمون کتاب کی بھول بھلیاں میں اصحاب نظر کی کسی قدر رہنمائی کر سکے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ مترجم کو کسی طرح کی زیادہ قابلیت یا بہتر واقفیت کا دعوٰی ہے نہیں ہرگز نہیں۔ غرض صرف یہ ہے کہ یہ ایک اچھوتا مضمون ہے۔ اور مترجم کے علم و یقین میں ابھی تک اردو زبان میں اس قسم کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور اہل وطن کا مذاق اس طرح کی تحقیق سے ناآشنا ہے۔ اس لئے موجودہ رسم و رواج کے لحاظ سے غالباً اس کو تھوڑے سے انٹروڈکشن کی ضرورت ہے۔ اور مترجم کو تھوڑی سی معذرت کی۔

گزشتہ سال انہی دنوں میں جب کہ میں مشن کالج راولپنڈی میں پروفیسر تھا۔ یہ کتاب یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ (Universal History of the World) مصنفۂ پروفیسر رڈپاتھ (Professor Ridpath) میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب امریکہ میں لکھی گئی ہے۔ اور سترہ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ اور چونکہ صرف ایک شخص کی دماغی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یقینی قابل قدر ہے۔ یوں تو انگریزی

ہیں متعدد تواریخ عالم موجود ہیں۔ جس میں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ مگر اس کتاب میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اس میں اہل مصر کا حال جو نوع انسان میں سب سے پہلے متمدن اور مہذب لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ نویں جلد میں شروع کیا گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کی آٹھ جلدیں (گویا تقریباً نصف حصۂ کتاب) اب سے کم و بیش ۵-۶ ہزار سال پہلے کی نا مہذب۔ خانہ بدوش۔ وحشی اور نیم وحشی اقوام انسانی کے حالات سے پُر ہیں۔ یہ حالات اپنی جدّت اور ہماری موجودہ طرز معاشرت سے بالکل مختلف ہونے کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ اپنے تعجب خیز و حیرت انگیز ہونے کے سبب سے الف لیلہ کے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف چونکہ وہ مشاہدات عینی اور واقعات یقینی پر مبنی ہیں۔ اس لئے ان کی صحت دیگر سوانح کی تاریخ سے کسی طرح کم نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایک زمانے میں ہمارے آبا و اجداد بھی انہی وحشیوں کے بھائی بند تھے۔ اور آج کل کی تمام قومیں انہیں جنگلیوں کی اولاد ہیں تو ان کے حالات معلوم کرنے کا شوق اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر ان حالات کو عام علم تاریخ پر یہ ایک اور بھی فضیلت ہے۔ کہ مہذب زمانے کی تاریخ کے اکثر حصے اقوام کی باہمی کشاکشی اور جنگ جوئی۔ یا افراد کی خود غرضی اور نفس پرستی کے افسانے ہیں۔ اور وہ بھی ایسے کہ ان کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس پر بے گناہوں کے خون ناحق کے چھینٹے نہ پڑے ہوں۔ اور جو ظالموں کی سیاہ کاریوں کے بیان سے سیاہ نہ ہوئے ہوں۔ اس کے برخلاف پُرانی نامہذب قوموں کے حالات اُن کوششوں اور جانفشانیوں کے قصے ہیں جو انسان نے شروع شروع میں ترقی کے اعلےٰ مدارج حاصل کرنے کے لئے کئے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُس وقت باہمی لڑائی جھگڑے نہ تھے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت نہ تو زر و جواہر اور مال و دولت کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ اس پر جانیں قربان ہوتیں اور سروں کی بھینٹیں چڑھائی جاتیں۔ اور نہ اپنے بھائی بندوں کے خون بہانے کے لئے وہ نئے

Marfat.com

اور خونریز آلات ایجاد ہوئے تھے جو ترقی کے زمانے میں روز نئے نئے رنگوں میں چمکتے ہیں۔ رہنے کے لئے خدا کی زمین وسیع تھی اور کھانے پہننے کے لئے درختوں کے پھل پتے۔ اور جانوروں کے گوشت اور اُن کے چمڑے کافی تھے اس کے سوا ان لوگوں کی تحقیق بھی قابل قدر ہے۔ جنہوں نے اُس زمانے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس زمانے میں لوگوں کو اپنے حالات قلمبند کرنے کا تو کیا اپنے جسم کو ڈھانکنے اور اپنے مردوں کو دفن کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اہل بصر خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان حالات کو عالمانہ طور پر تحقیق کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور پھر ان کو قیاس صحیح اور عقل سلیم کے بالکل مطابق ثابت کرنا کس قدر دشوار ہے۔ آج کل کی سائنس کی عملی ترقیاں اور نت نئی ایجادیں تو زمانے بھر کو دنگ کئے ہوئے ہیں ہی مگر میدان خیال میں بھی اس کی جولانیاں کچھ کم تعجب خیز نہیں ؛

انہی وجوہ سے مجھے اس کتاب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اور اس کا کچھ حصّہ دیکھنے کے بعد مجھے وہ کتاب اس قدر انوکھی اور ایسی دلچسپ معلوم ہوئی کہ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے اپنے اُن دوستوں کو بھی سُناؤں جو انگریزی زبان سے ناواقف اور موجودہ علمی تحقیقات سے ناآشنا ہیں۔ اگرچہ اس عزم کے پورا کرنے میں بہت سی مشکلیں تھیں مثلاً کتاب کی ضخامت میری عدیم الفرصتی اور اہل وطن کی بے توجہی۔ اس پر مضمون کی کہیں کہیں عقائد مذہبی سے مخالفت مستزاد۔ اور ان سب دقتوں پر طرہ یہ کہ خود زبان اردو ابھی تک ایسے مضمون کو ادا کرنے میں قاصر ہے۔ اور مختلف علوم کے اصطلاحی الفاظ کو عام فہم اردو میں لانا دشوار ہے۔ یہ سب عوائق بہت کچھ دل شکن تھے مگر طبیعت نے کہا کہ "بیا بگذر کہ از بہر گزشتنہاست حائلہا" شوق نے ان رکاوٹوں ہی کو محرک بنا لیا اور اردو میں نئی معلومات کی کتابوں کی کمیابی اور اہل ملک کی جدید تحقیقات کے نتائج سے ناآشنائی نے مجھ جیسے کم لیاقت اور بے بضاعت کو بھی اپنی زبان کی توسیع میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ اور میں نے ابنائے وطن کی ضیافت طبع کے لئے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ زبان دانی کا دعوےٰ نہیں ہاں۔ زبان دانوں کو غیرت دلانا مدنظر ہے ؛

کتاب کا پہلا حصہ جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان وحشیوں کے حالات پر بحث نہیں کرتا۔ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا بلکہ اس میں صرف ایک امر کی تحقیق کی گئی

ہے۔ اور وہ یہ کہ "نوع انسان کا آغاز کب ہوا؟ کہاں ہوا؟ اور کیونکر ہوا؟" اور یہ تحقیق صرف جدید مشاہدات عینی اور واقعات یقینی کی بنا پر کی گئی ہے۔ اور ان سے قیاس صحیح کے مطابق نتائج نکال کر ان سوالات کا جواب دینا چاہا ہے۔ اور اس کوشش میں متعدد علوم جدیدہ کی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے۔ چنانچہ صرف آغاز انسان کے زمانے کی تعین میں ۹ متفرق علموں کے ذریعے سے نتیجے اخذ کئے ہیں اور یہ سب علم ایسے ہیں کہ ابھی تک یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب بھی خال خال ہی ان سے واقف ہونگے۔ مجھے ان جوابات کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں۔ میرا مطلب ان کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنے سے صرف یہ ہے کہ یہاں والے بھی ان مختلف علوم کے موضوع اور مبحوث فیہ مضامین سے کسی قدر آگاہ ہو جائیں۔ اور جس طرح عملی ترقیوں میں نئی نئی ایجادوں کا نام سنا کرتے ہیں اسی طرح علمی تحقیقات اور فلسفیانہ معلومات میں بھی ان کے کان ان انوکھی اور ان سنی باتوں سے نا آشنا نہ رہیں۔ اور ان کو کم سے کم اتنا تو معلوم ہو جائے کہ دوسری قومیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔

یہاں ممکن ہے کہ بعض اصحاب یہ اعتراض کریں کہ وہ ترقی کس کام کی جو حق سے گمراہ کرنے والی ہو۔ اور اس علم سے کیا فائدہ جو ایمان کو مٹانے والا ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا کوئی علم واقعی گمراہ کن ہے بھی یا نہیں۔ میرے خیال میں صحیح علم خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو۔ گمراہی اور ضلالت سے بچانے والا ہوتا ہے۔ نہ کہ خود راستہ سے بھٹکانے والا۔ کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی چیز کی اصلی حقیقت سے واقفیت کیونکر ہم کو راہ حق سے بہکا سکتی ہے۔ یا کسی امر کی ماہیت کا سچا علم کس طرح ہم کو اصول حقیقی سے برگشتہ کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غلطیوں اور برائیوں کو بھی جان لینا ضروری ہے۔ تا کہ ہم اُن کی کنہ کو سمجھ کر ان سے زیادہ اچھی طرح بچ سکیں۔ اُس بات کا مجھے اطمینان ہے کہ اہل ملک کے مذاق اور مضمون کی دشواری اس کتاب کو عوام الناس میں مقبول نہ ہونے دیگی۔ بقول غالب ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے * خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

Marfat.com

اور اسی جماعت پر مسائل مذہبی کی چھان بین سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی داں اصحاب پہلے ہی سے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ان پر ایسی ایسی خفیف باتیں کوئی نمایاں اثر نہیں رکھتیں۔ دوسرے وہ اپنی علمی قابلیّت کے لحاظ سے بھی ترجموں کے محتاج نہیں۔ ان کے خیالات پر اثر ڈالنے کے لئے خود اصل کتابیں ہی کیا کم ہیں +

اس مضمون کے ترجمے سے میرا مطلب یہی ہے کہ جہاں کہیں اہل بصر اس کو مخالف حق پائیں تو خود کوشش فرما کر اور اس کی معقول تردید کر کے اپنے ان نوجوان احباب کو جو مروجہ علوم انگریزی کی تعلیم پا کر اس طرح کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس گرداب ضلالت سے بچالیں۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ دیگر اقوام کے مقابلے میں خود تحقیق حق کر کے اُن کے لئے بھی راہ راست کی ہدایت کی کوشش کریں۔ تاکہ تبلیغ مذہب کا حق ادا ہو جائے +

اس گزارش سے میرا مدعا یہ ہے کہ اہل نظر کو اس کتاب کی اشاعت کی بابت میرا واقعی منشا معلوم ہو جائے۔ اور میں بے وجہ ہدف ملامت نہ بنایا جاؤں اگر ناظرین با تمکین کے نزدیک میرے عذرات قابل پذیرائی ہوں تو چشم ما روشن۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ خدا علّام الغیوب اور ستّار العیوب ہے +

یہاں چلتے چلتے ایک نظر یہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ مضمون حقیقت میں عقائد مذہبی کے مخالف یا ان سے مختلف ہے کہاں تک۔ عوامُ النّاس کے اعتقادات میں واقعی اُصول مذہب کے ساتھ اور بہت سے حشو و زوائد بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ جن کی بنا عموماً یا تو اپنے بزرگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے۔ یا اُس زمانے کی علمی اور ذہنی ترقیوں کے نتائج پر جو رفتہ رفتہ عام ہو کر عوام کے دلوں میں جاگزین ہوتے رہتے ہیں۔ اور جو آہستہ آہستہ یا تو خود مذہبی عقائد کے ہم رنگ ہوتے جاتے ہیں۔ یا مذہبی خیالات کو اپنے ڈھنگ پر لاتے جاتے ہیں۔ اور اگرچہ شروع شروع میں علمائے مذہب ان کی تردید کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شدہ شدہ ان کا اثر اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ تقاضائے فطرت سے مجبور

Marfat.com

ہو کر خود علما بھی اُن سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اور یہ ہے بھی ضروری کہ علما اور عوام کے معتقدات میں کوئی بیّن فرق اور نمایاں اختلاف نہ ہو۔ کیونکہ مقتدی اور مقتدے کا مختلف راستوں پر چلنا لفظی تعارض اور لغوی تناقض ہے +

اس وقت تو خیر ان خیالات کا دل و دماغ میں جاگیر ہونا ضروری بھی ہے اور مناسب بھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ انسان کا علم اور اس کا دماغ ایک جگہ ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ اور مذہب روز بروز بدلنے والا نہیں۔ اور یوں ایک متحرک اور ایک ساکن چیز کی باہمی آمیزش سے نہ تو ساکن اپنی جگہ پر برقرار رہ سکتا ہے اور نہ متحرک اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ جب زمانے کے انقلاب اور علم کی ترقّی سے خیالات کا رنگ بدل جاتا ہے اور نئی تحقیقات اور پرانی معلومات میں کشمکش ہوتی ہے۔ اور یہ کشمکش اکثر صحت علمی کے لحاظ سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ زمانے کا رنگ ہی بدل جانے کے بعد نئے عہد میں پُرانے خیالات کے حامی بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں وہ پُرانے خیالات مذہبی عقائد کا جزو بن گئے ہیں وہاں ان کی حمایت میں سر دیدینا بھی آسان سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی دماغی ترقّی میں کس قدر نقصان پہنچنا ممکن ہے۔ اور ساتھ ہی جب نئے خیالات کسی وجہ سے غلبہ پا لیتے ہیں۔ اُس وقت پُرانی باتوں کی تکذیب کے ساتھ ہی مذہبی اعتقادات میں کتنا بڑا تزلزل اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالوں سے تاریخ کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ اسلام اگرچہ ایک ایسا مذہب ہے جس کے اصول پر بہت کم چیزیں اپنا اثر ڈال سکتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی سینکڑوں ہزاروں بزرگ ہیں جو اسی کشاکش خیالی پر قربان ہوئے ہیں۔ اور اَور مذہبوں میں تو نہیں معلوم کتنے ہزاروں لاکھوں ناکردہ گناہوں کا خون اس کی گردن پر ہے +

میرا یہاں اس بیان سے یہ مطلب ہے کہ علمی نتائج کو مذہبی عقائد سے ملانا نہایت خطرناک اور مضر ہے۔ اس لئے حتی الامکان ان دونو کو ہمیشہ جدا جدا رکھنا چاہئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اکثر ان کو غیر ضروری طور پر باہم مختلط کیا

جاتا ہے۔ عام طور پر دنیاوی علم اصولِ مذہب اور الٰہیات پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے موضوع ہی جدا جدا ہیں۔ مذہب کی بحث ان تعلقات سے ہے۔ جو انسان اور اس کے پیدا کرنے والے میں ہیں۔ اور یہ بھی کسی فلسفیانہ پہلو سے نہیں۔ بلکہ اس صاف اور سادہ حیثیت سے کہ آدمی کیونکر اپنے خالق کی خوشنودی اور اپنے مالک کی رضامندی حاصل کرکے ابدی راحت اور سرمدی مسرت پا سکتا ہے۔ وہ ادائے فرائض کے فوائد بتا کر نیکو کاری کی تعلیم کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر واقع میں صانع مطلق کی قدرت دکھا کر ایصال الی الحق کے راستے بتاتا ہے۔ اور پرانے زمانے کے حیرت خیز واقعات سنا کر ہر قسم کے فواحش سے روکتا ہے۔ نظام فیثا غورث اور اصول بطلیموس سے بحث نہیں کرتا۔ مدارات کواکب و گردش سیّارات کے اصول نہیں سمجھاتا۔ اور پرانی قوموں کے تاریخ وار افسانے نہیں سناتا۔ اور جو مذہب اس قسم کی کسی بحث کی بابت قول فیصل ہونے کا مدعی ہو۔ وہ گویا خود اپنے منہ سے اپنا ابطال کرتا ہے۔ اسلام نے تو شروع ہی میں جہاں اپنی کتاب مقدس کے لئے لا ریب فیہ کا دعوےٰ کیا ہے وہیں اس کا منشا بھی جتا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہے *

اس کتاب کے مبحوث فیہ تین مسئلوں میں سے کم از کم پہلے دو کی بابت اصول مذہب اسلام کوئی معیّن جواب نہیں دیتے۔ اس لئے آغاز انسان کے زمان و مکان کی بحث میں کہیں اس کا عقائد مذہبی سے تناقض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے۔ وہاں اسی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ یعنی موجودہ قیاسات ان قدیم خیالات کے منافی ہو گئے جن کو عوام نے غلطی سے عقائد مذہبی کا جزو سمجھ کر محترم بنا لیا ہے۔ حالانکہ ان میں اگر کچھ وجہ احترام ہے تو صرف یہی کہ وہ قدما کی تحقیقات کا نتیجہ اور اس زمانے کے خیالات کا خاکہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتب تاریخ معتبر (مثلاً ناسخ التواریخ وغیرہ) میں واقعات کے لئے تعیین اوقات ہبوط آدمؑ سے کیا گیا ہے۔ اور یہ واقعات سے تقریباً ۸-۷ ہزار سال پہلے کا قرار دیا گیا ہے۔ مگر

Marfat.com

اس زمانے کا اندازہ جیسا کہ مصنف کتاب ہذا نے بھی بیان کیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے تخمینے سے کیا گیا ہے اور اس کی بنا ان عمروں پر رکھی گئی ہے۔ جو کتاب توریت وانجیل نے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد کے اور انبیا علیہم وعلی رسولنا الصلوٰۃ والتحیات کے لئے ٹھہرائی ہیں۔ مجھے یہاں اس معیار کی صحت پر بحث کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہیں ان پیغمبروں کی عمروں کو اپنی تعلیم وتلقین کا جزو بنانا مناسب خیال نہیں فرمایا۔ اور فی الحقیقت اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میرے خیال میں تو مذہب کی کتاب کو اپنی صداقت کے لئے بزرگوں کا شجرۂ نسب ہونے کی ضرورت نہیں اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں تاویل و تحریف کی گنجائش بہت ہے۔ لیکن اگر ہم اسمائے انبیا کے اس اختلاف کو بھی چھوڑ دیں جو اسلام اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں ہے۔ اور توریت کے اعداد کو بالکل صحیح بھی مان لیں۔ اور اس کے مختلف نسخوں کے اس اختلاف سنین کو بھی نظر انداز کر دیں جن کا ذکر اس کتاب کے مصنف نے اس بحث میں کیا ہے۔ تب بھی اس بات کا کیا ثبوت ہے۔ کہ یہی وہ تمام پیغمبر ہیں جن کی عمروں سے ہبوط آدمؑ کے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور ان کے سوا نہ کوئی اور پیغمبر ہوا اور نہ کوئی ان کے درمیان میں وقفہ گزرا۔ ان باتوں کو عقائد مذہبی کی شان تو کسی طرح دی ہی نہیں جاسکتی۔ اور جو لوگ اب بھی ان کی صداقت تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ پہلے وہ ان تمام اعتراضوں کا توشافی جواب دے لیں۔ جو نظر اول میں ان پر وارد ہوتے ہیں۔ اسلام نے جس طرح ابتدائے انسان کے زمانے کی تعیین نہیں کی ہے۔ اسی طرح وہ اس کے آغاز کی جگہ کے باب میں بھی ساکت ہے۔ اگرچہ ابو البشر کو پہلے جنت میں مقیم بنایا گیا ہے وقلنا یا ادم اسکن انت وزوجک الجنۃ اور پھر معتوب بارگاہ یزدانی ہونے کے بعد ان کو زمین پر اتارا گیا ہے وقلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین لیکن اس میں کہیں بھی ان کے مسکن کی اس جغرافی کیفیت کی تصریح نہیں کی گئی۔ جس نے عیسائیوں کو اس کی تلاش میں اس قدر سرگرداں کیا

Marfat.com

ہے۔ جیسا کہ مصنّف کتاب لکھتا ہے۔ مذہب کو یہ بتلانا منظور ہی نہ تھا کہ حضرت آدمؑ لنکا میں گرے تھے یا عدن میں۔ زمین پر پیدا کئے گئے تھے یا آسمان پر۔ اس کو تو صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ ایک ذات واجب الوجود نے اپنی قدرت صانعہ اور حکمت بالغہ سے ایک ایسے ذی حیات کو مخلوق کیا جو اپنی عقلی اور دماغی قوتوں کی وجہ سے تمام کائنات میں ممتاز تھا۔ اور جس کی عظمت و طاقت کے سامنے اُس وقت کے ہر کہ ومہ نے سر تسلیم خم کیا تھا۔ اس لئے اس کو بھی لازم ہے کہ اپنے خالق کے احکام کی فرماں بری کرے اور اپنی اس بزرگی کو قائم رکھّے جس نے اسے مسجود ملائکہ بنا دیا تھا۔ اس غیر ضروری صراحت کے نہ ہونے سے جائے ابتدائے انسان کے متعلق کوئی بحث معتقدین اسلام کے خیالات کے معارض نہیں ہو سکتی اور ہم بدو نوع کے لئے سطح زمین کی ہر ایک جگہ تسلیم کرنے کیلئے یکساں تیار ہیں ہمیں یہ ماننے میں عذر نہیں کہ اگر کسی زمانے میں اس مہبط آدمؑ کے لئے کوئی خاص جگہ مثلاً لنکا یا سنگلدیپ ٹھہرائی گئی تھی تو اس وقت اس کی صحت کو مان لینا بالکل بجا تھا۔ اور اگر آج کل کی نئی تحقیقات چند دن بعد غلط ثابت ہو جائے تو کچھ بیجا نہ ہو گا۔ اور جس طرح قدما اپنے اس قیاس میں معذور ہیں اسی طرح موجودہ زمانے کے علما اس کے متعلق اپنی رائے میں قابل معافی ہونگے۔ لیکن غلطی یہ ہے کہ اس میں سے کسی بات کو بھی خواہ وہ پُرانے زمانے کا قیاس ہو یا موجودہ عہد کا خیال عقائد مذہبی میں داخل کر کے یقینی اور حتمی سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ان قیاسات کا ہر روز ادل بدل ہونا ممکن ہے۔ اس لئے ان کو مذہب کی ازلی اور ابدی صداقتوں کے ساتھ جکڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور اگر بالفرض انقلاب ازمنہ کے ساتھ اختلاف اقوال نہ بھی ہو۔ اور کوئی بات قرنہا قرن تک مسلم رہے۔ تب بھی اس کا مذہب کے محترم حریم میں آنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے مضامین کے متعلق پُرانے خیالات جو عقائد مذہبی کا جزو بن گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں چونکہ لوگوں کے دل و دماغ میں یہی باتیں چکّر لگا رہی تھیں اس لئے اقوال مذہبی کی تعبیر بھی ایسے پیرائے میں

کی گئی - جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہوگئی - اور یوں دونو باتیں باہم مدغم ہو کر ہمصفیر ہو گئیں +

کم از کم میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر اس وقت بھی کوئی چاہے تو اکثر مسائل جدیدہ مثلاً اسی مضمون کو آیات قرآنی سے تطبیق دے سکتا ہے - اور یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں - اگر وہ پرانے عقائد سے خالی الذہن ہو کر ان خیالات کو اپنے دماغ میں لے کر کتب مذہبی کا مطالعہ شروع کرے تو وہ بے تکلف ان کی ایسی شرح کر سکیگا - جو خواہ مخواہ ان خیالات کے مطابق ہوگی - اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کتابوں کی صداقت میں کوئی فرق آتا ہے - نہیں - بلکہ بات یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے دنیا کی ہر ایک چیز کو اپنی معلومات کی روشنی میں دیکھتے ہیں - اور ہر ایک بات کو اپنے خیالات کے رنگ میں پاتے ہیں +

مثال کے طور پر اس مضمون کو لیجئے - عام طور پر یہ بات مانی جاتی ہے - کہ حضرت آدمؑ جزیرہ سنگلدیپ یا لنکا میں گرے تھے - چنانچہ کوہ آدم اور آدم کا پل ابھی تک اس عام اعتقاد کے شاہد ہیں - اب یہ مضمون نسل انسانی کے آغاز کی جگہ ہندوستان کے جنوب میں بحر ہند کی غرقاب شدہ زمین کو ٹھہراتا ہے - اور یہ دونو باتیں تقریباً گویا بالکل باہم متفق اور مطابق ہیں - اور گویا ان کی تطبیق کی کوشش حصول حاصل ہے - اس نئی تحقیق کی روشنی میں مہبط آدمؑ کے لئے لنکا کو ٹھہرانا کتنا قرین قیاس اور مطابق عقل معلوم ہوتا ہے - ہمارے ان قدیم اور دور کے بزرگوں نے جب ہوش سنبھالا ہوگا - اور اُن کو اپنے قدیم آبا و اجداد کا مسکن یاد آیا ہوگا تو بے تحاشا ان کی نظریں اسی سمت اُٹھی ہونگی - جو ان کے بزرگوں نے نسلاً بعد نسلٍ اپنے آنے کی بتائی ہوگی - اور جب جنوبی سمت میں لنکا کے سوا حد نگاہ اور وسعت خیال تک برابر پانی ہی پانی موجیں مارتا پایا ہوگا تو خواہ مخواہ اسی جزیرے کی سب سے اونچی چوٹی پر نگاہیں پڑتی ہونگی - اور اسی کو اپنا سرچشمہ خیال کیا ہوگا - اس خیال کے ساتھ ہی یہ بات از خود ذہن میں آتی ہے - کہ اس جائے ابتدا کی چاروں طرف بحر مواج کو لہریں مارتا ہوا دیکھ کر ان لوگوں کو طبعاً یہ خیال آیا ہوگا کہ غالباً

ہمارا جدِ امجد ابو البشر آسمان پر پیدا ہوا ہو گا۔ اور پھر وہاں سے کسی طرح معتوب بارگاہ کبریائی ہو کر اس سرزمین پر پھینک دیا گیا ہو گا۔ اور یوں حضرت آدمؑ کی آسمانی پیدائش کا خیال پیدا ہوا ہو گا۔ اب اگر ہم حضرت آدمؑ کے جنت میں رہنے کی حالت کو ایک روحانی حالت سمجھ لیں۔ اور اس کے بعد ان کے ہبوط کو ان کے مادی اور دنیاوی ظہور کے معنوں میں لیں تو بہت سی مشکلیں بے دقت حل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ہم تھوڑی سی جرأت کر کے لفظ "جنت" کو اس کے لغوی معنوں میں لے کر اس کا ترجمہ "مخفی مقام" کریں۔ اور شجر ممنوعہ سے گیہوں یا انجیر وغیرہ کی بجائے "عقل و خرد" مراد لیں۔ تو اس مضمون کی متعلقہ آیات صداقت سمات کا مطلب یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ خالق کائنات نے آدمؑ کو خلق کرنے کے بعد اس کو ایک مدت تک نادان اور بے سمجھ رکھا۔ اور اسے بتا دیا کہ اگرچہ اس میں تمام قسم کی قابلیتیں مضمر رکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا الخ سے ظاہر ہے۔ لیکن اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اگر مگر کے ہیر پھیر میں پڑنے اور عقل و خرد کے اُتار چڑھاؤ میں پھنسنے سے بچائے رہے۔ ورنہ وہ اپنے نفس پر ظلم کریگا"۔ چنانچہ ایک عرصے تک تو انسان اسی عالم بے خبری میں رہا۔ مگر آخر اس کا نفس کا فرکیش اسے اکسا اکسا کر ہوش میں لے آیا۔ اور گویا آدمی اس جنون یا پوشیدگی سے نکل کر صفحۂ زمین پر آگیا۔ اور اس ہوش میں آنے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنی برہنگی کا خیال آیا۔ اور اس نے اپنے جسم کو درختوں کے پتوں سے ڈھانکنا شروع کیا۔ اسی حالت کا کلام الٰہی میں ان پاک الفاظ میں ذکر کیا ہے فلما ذاقا الشجرة بدت لھما سواٰتھما وطفقا یخصفٰن علیھما من ورق الجنة ان تشریح سے اس معاملے کی بابت حال کی تحقیقات اور مذہبی بیان میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے۔ اور اس تاویل کے لئے آیات قرآنی کے صرف دو لفظوں کے معنی عرف عام سے کسی قدر مختلف کرنے کی ضرورت ہوئی۔ میرے خیال میں ان دو لفظوں کے جو معنی مذکورۂ بالا عبارت میں میں نے لئے ہیں وہ کچھ بہت بعید از خیال اور دور از کار نہیں ہیں۔

"جنت" کے معنی مخفی مقام کے ہوتے ہیں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا۔ غرض عام ہیں جو جنت۔ جنت کہلاتی ہے۔ وہ بھی اپنے اخفا ہی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے۔ علی ہذا القیاس جن۔ جنون۔ جنین۔ جنان۔ وغیرہ تمام الفاظ اپنے غیر مرئی ہونے کے لحاظ سے ہی ان ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ شاید کوئی صاحب فرماویں کہ لفظ جنت کے ان معنوں میں تو بحث نہیں۔ مگر جنت تو آسمان پر مانی جاتی ہے۔ یہ ایک نئی جنت بحر ہند میں سے ڈوبی ہوئی کہاں نکل آئی؟ میں ان کے اس نہایت بجا اعتراض کی صحت کا معترف ہوں مگر میں اس کے جواب میں یہ کہونگا کہ اس معروف جنت کا بھی بالائے فلک ہونا کم ازکم مختلف فیہ تو ضرور ہے۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ عام اعتقاد کے مطابق بھی ایک جنت یعنی باغ ارم کو تو صفحہ زمین ہی پر مانتے ہیں۔ یہ بھی نہ سہی۔ مگر ہم یہ تو ضرور کہینگے کہ اس زمانے میں یہ زمین ہر قسم کے شور و شر سے پاک ہوگی۔ چاروں طرف قدرت کا سدا بہار گلزار اور ہمیشہ بہنے والی نہریں ہونگی۔ کھانے کے لئے عمدہ سے عمدہ میوے اور سیر کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے پھول ہونگے۔ پھر کیا وجہ کہ خدا اس جگہ کو جنت سے تعبیر نہ کرتا مشہور ہے

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد + کسے را با کسے کارے نباشد

پھر اس پر بے فکری کا عالم اور بے خبری کی حالت۔ سچ تو یہ ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ حقیقی جنت میں بھی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے۔ اور وہ یہ کہ اس مضمون کے متعلق خدا نے ہر جگہ "جنت" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے مرادف الفاظ اور بھی بہت سے ہیں۔ جو اس موعودہ عالم مسرت و اطمینان کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً خُلد ہی ایک ایسا لفظ ہے۔ جو کلام الٰہی میں اس جگہ کے لئے اکثر آیا ہے۔ اور اس کے دوام کے اظہار کے لئے ہے بھی بہت موزوں۔ مگر حضرت آدم ؑ کی ابتدائی جائے رہائش کے بیان میں خدا نے ہر جگہ اسی لفظ جنت کو فرمایا ہے۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی یہ بات بھی خیال میں آجائے کہ آغاز بشر کا مقام بالکل نامعلوم ہے۔ یا یہ کہ وہ تحقیقات جدیدہ

Marfat.com

کے موافق) سطح آب میں چھپ چکا ہے تو اس کے لئے جنت کا لفظ اور بھی زیادہ متناسب اور پُر معنی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دلائل کچھ بہت قوی نہ ہوں مگر جب ان کا یکجائی اثر حال کے خیالات کے ساتھ ملا کر دیکھا جاتا ہے تو میرے خیال میں تو وہ بہت معقول اور پُر زور ہو جاتے ہیں۔ دوسرا لفظ جس کی تعبیر معمولی ترجمے سے مختلف کی گئی ہے۔ وہ الشجرۃ ہے۔ عموماً اس سے گیہوں کا درخت سمجھا گیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے اسے انجیر یا انگور کا درخت خیال کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ شجریت کے لحاظ سے یہی معنی موزوں بھی ہیں۔ مگر میں نے اس کے جو معنی لئے ہیں وہ اگرچہ لفظی لحاظ سے بہت بعید از قیاس ہیں۔ مگر معنوی حیثیت سے کم از کم مجھے تو بہت چسپاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میں کچھ خودستائی سے نہیں کہتا۔ بلکہ میں ان کے سوا اس کا اور کوئی مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتا۔ عام معنوں پر سب سے پہلے تو طبعاً یہی سوال وارد ہوتا ہے۔ کہ گیہوں۔ انجیر۔ یا انگور یا اور کسی خاص درخت کے پھل کو روکنے سے اللہ نے کیا فائدہ مدنظر رکھا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ مشیّت ایزدی کی مصلحتوں پر بحث کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ مگر اتنا تو ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ خدا کا کوئی حکم خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہ وہ ہمارے ہی فائدے کے لئے ہوتا ہے۔ کچھ اس لئے نہیں ہوتا کہ خدا کو اپنے حکموں کی تعمیل کرانے کا شوق ہے۔

اب جہاں تک ہماری عقل کام کرتی ہے۔ کسی خاص درخت کو اس تشدد کے ساتھ ممنوع بنانے میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ اور پھر وہ درخت بھی ایسا جو بعد میں انسان کے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ اور جس سے تمام آدمیوں کو نہ کوئی خاص رغبت ہے نہ کوئی نفرت۔ گیہوں تو خیر کسی قدر عام استعمال کی چیز ہے بھی۔ مگر انجیر اور انگور کا تو ۹۰ فی صدی آدمیوں نے کھانا کیا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ زیادہ مستند قول یعنی گیہوں کی صورت میں یہ بھی دقت ہے۔ کہ اپنی موجودہ حالت میں تو گیہوں ایسی چیز نہیں جسے آدمی بے کسی قسم کی تیاری کے کھا سکے۔ لیکن خیر شاید وہ کچھ اور طرح کے گیہوں ہوں۔ اس مضمون

Marfat.com

کی آیات قرآنی ہیں تو اس ممنوعہ شجر کے پاس جانے سے بھی آدم کو روکا ہے۔ کھانا تو بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس درخت کے پاس جانے کا نتیجہ یہ فرمایا ہے کہ فتکونا من الظالمین ممکن ہے کہ یہ نتیجہ حکم ایزدی سے سرتابی کا ہو۔ لیکن فحوائے کلام سے یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ثمرہ خود اس درخت سے قریب ہونے کا ہے۔ اور گویا خدا تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اس سے اسی طرح ڈرایا ہے۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو آگ کے ہاتھ لگانے سے روکے۔ اب اگر اس گناہ کی سزا کو دیکھا جائے تو وہ اپنی نوعیت میں سخت ترین گناہوں کی سزا سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اور جو ضرر نوع انسان کو اس سے پہنچا ہے وہ کسی درخت کی قربت کیا احکام الہٰی کی نافرمانی سے بھی پہنچنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے گناہ یہاں تک کہ شرک اور الحاد کی سزا بھی بحکم لا تزر وازرۃ وزر اخری خود ذات فاعل ہی تک محدود رہتی ہے اور عصیاں ور نافرمانی تو ایسے گناہ ہیں جو ہم خطاکار ہر وقت ہی کرتے رہتے۔ ان کی تو کچھ گنتی ہی نہیں لیکن اس جرم کی سزا ایسی سخت ہے کہ وہ حضرت آدمؑ کی تمام اولاد کو دی جا رہی ہے۔ اور قیامت تک دی جاتی رہیگی۔ کیونکہ ہمارا جنت سے نکالا جانا۔ اس الم آشوب دنیا کے ہر دم کے ظلم وستم سہنا۔ اور پھر اس کے بعد آیندہ کی سزا و جزا میں مبتلا ہونا کیا کچھ کم سزا ہے۔ اور یہ سب کچھ کس لئے صرف حضرت آدمؑ کے اس درخت یا پھل چکھنے سے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک حکم کی نافرمانی کی وجہ سے۔ حافظ نے خوب کہا ہے ؎

من ملک بودم و فردوسِ بریں جا یم بود
آدمؑ آورد دریں دیر خراب آبادم

میں احکام ایزدی سے سرتابی کو کوئی چھوٹی سی بات نہیں کہتا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں۔ کہ موجودہ احکام شریعت میں سب سے زیادہ تاکیدی حکم بھی اگر پورا نہ کیا جائے۔ تو بھی اس کی سزا فاعل کے سوا کسی دوسرے کو نہیں دی جاتی اور معذرت اور استغفار کی صورت میں خود فاعل سے بھی درگزر کرنے کا وعدہ صادقہ ہے۔ چہ جائیکہ اس جرم میں فاعل کے تمام لواحقین و متعلقین ابد الآباد تک ماخوذ رہیں۔ اور کوئی ایسا ممنوعہ درخت اب بھی

نہیں مل سکتا جس کو نوع انسان کا ہر فرد بشر استعمال کرتا ہو اور اس سے قابل سزا ٹھہرایا جا سکے۔ چونکہ اس سے منصف حقیقی کے رحم و انصاف پر اعتراض ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں لفظ شجر اور عصیان آدم کی ایسی تشریح ہونی چاہیئے۔ جو تمام نوع انسان کو گھیر لے۔ اور جس کی وجہ سے وہ سب کے سب بلا استثناء سزا و جزا کے پھندے میں آجائیں۔ اب اگر غور کیا جاے تو ایسی چیز جس پر سزا اور جزا کا مدار ہے عقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے۔ جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اور نوع انسان میں بھی جن لوگوں کو کسی وجہ سے عقل سے محروم مان لیا گیا ہے وہ قانون اور شریعت دونوں کی پابندی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اور دین اور دنیا دونو کے جھگڑوں سے نجات پا گئے ہیں۔ اس لئے میری راے میں تو عقل ہی ایک ایسی مضر چیز ہو سکتی ہے۔ جو ہمیشہ کے لئے انسان کو احکام شریعت کی بجا آوری کا مکلف بنا سکتی ہے۔ اور جس کے حاصل کر لینے کے بعد انسان اس جنت مثال عالم بے خبری سے نکل کر گویا اس دنیا کی تکالیف و حوادث کا آماجگاہ بن سکتا ہے۔ اور یہ سزا کچھ خدا کی نافرمانی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ خود حصول عقل ہی کا تقاضا ہے۔ بقول ذوق ؎

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا ۔۔۔ کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا

میرے خیال میں وہ بار امانت بھی یہی ہے جس کا کلام پاک میں ارشاد ہے کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ دیکھئے خدا تعالےٰ نے یہاں بھی اپنی ہی پیش کردہ امانت کے اٹھا لینے پر انسان کو اپنے اوپر ظلم کرنے والا ٹھہرایا ہے ؂

تیسرا مسئلہ البتہ ایسا ہے کہ جسے اہل مذہب ہی نے نہیں بلکہ عام طور پر سب نے ہی مردود کیا ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے تو اہل یورپ و امریکہ بھی کسی طرح اس کے قائل نہ ہوتے تھے۔ مگر آخر رفتہ رفتہ اُنہوں نے تو اس کو تسلیم کر لیا۔ اور تسلیم کرنے کے بعد اس کی اسقدر قدر کی کہ آج وہ ایک ایسا پیش پا

Marfat.com

افتادہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ جیسے بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور جس کی کسی قسم کی تشریح و توضیح کی حاجت نہیں خیال کی جاتی۔ گویا کبھی اس سے انکار یا اختلاف کیا ہی نہ گیا تھا۔ ہاں اہل ہندوستان نے ابھی تک اچھی طرح اس مسئلے کو سنا بھی نہیں کہ یہ ہے کیا۔ اور اس سے مطلب کیا ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ عقائد مذہبی کے مخالف ہونے کے علاوہ ہمارے ان خیالات کا منافی ہے جو ہم نے اپنے گہواروں میں اپنے ماں باپ سے حاصل کئے ہیں۔ اور جو ہماری طبیعتوں کا جزو۔ اور ہمارے اعتقادات کی بنا بن گئے ہیں۔ میں یہاں اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ اور میری رائے کچھ وقعت بھی نہیں رکھتی۔ مگر میں یہ ضرور کہونگا کہ اہل نظر اس کو ایک دفعہ غور سے دیکھیں ضرور۔ کیونکہ اگر خود اس مسئلے کے نئے اور عجیب ہونے کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی یہ اس حیثیت سے ضرور قابل غور ہے کہ اب یہی مسئلہ تمام علوم جدیدہ کا مدار بنایا جا رہا ہے۔ اور آج کل کے تمام فلاسفہ مغرب کے مسائل کا اصل اصول ہو گیا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے وقت اس بات کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ ہستی واجب الوجود اور روح سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ اور انکار کر ہی کیونکر سکتا ہے۔ جب اس نے ان امور کی بحث کو اپنے موضوع ہی میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے ایک بڑی مباینت جو اس میں اور اصول مذہب میں ہو سکتی تھی۔ نہیں رہتی۔ اس مسئلے کی بحث صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کی موجودہ اشیائے ذی حیات نے یہ موجودہ صورت کس طرح حاصل کر لی۔ گویا یہ مسئلہ مختلف حیوانات کے وجود و حیات کا سبب قریب تلاش کر کے ان سب کو ایک سلک انتظام میں منظوم کرنا چاہتا ہے۔ تمام اشیا کے سبب بعید اور علت العلل پر کسی طرح کی بحث یا گفتگو نہیں کرتا۔ اور یہ ظاہری بات ہے۔ کہ اگرچہ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ فی الحقیقت ہر فعل کا فاعل اور ہر کام کا آمر خدائے تعالےٰ ہی ہے۔ لیکن دنیوی لحاظ سے مختلف اسباب قریبہ کی چھان بین اصولاً مخالف مذہب نہیں ہو سکتی۔ ورنہ شریعت کے تمام احکام بے کار ہو جائیں۔ اور انسان کا فاعل

Marfat.com

مختار ہونا ناممکن بن جائے۔ جس سے نہ دنیوی قانون کی پابندی قائم رہے۔ نہ دینی احکام کی تعمیل لازمی ٹھہرے۔ اور اس طرح تمام نظام عالم درہم وبرہم ہو جائے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بے ابر صدف قطرۂ از بحر نیابد　　　در عالم امکاں نتواں ترک سبب کرد

ہر شخص اپنے کاروبار میں تھوڑی دور تک ظاہری اسباب تلاش کرتا ہے۔ اور اگر وہ فاعل حقیقی کو بالکل بھولا ہؤا نہیں تو کچھ بیجا نہیں کرتا۔ افراد انسانی وحیوانی کی خلقت میں بھی بہت سے مختلف مدارج تو مذہباً اور عقلاً ہم تسلیم کرتے ہی ہیں۔ جن میں سے ہر ذیحیات شئے کو اپنی ابتدا سے انتہا تک گزرنا ہوتا ہے۔ اس مسئلے نے صرف عرف عام سے کسی قدر زیادہ دور تک کے اسباب ظاہری تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو مدارج ہم پہلے سے افراد کے لئے مانتے آتے تھے۔ اسی قسم کے مراتب اس نے انواع و اقسام حیوانات کے لئے بھی ثابت کئے ہیں۔ اور جس طرح ہم چند بھائی بہنوں کا ایک ماں باپ کی اولاد ہونا۔ یا چند قبائل کا ایک قوم کی شاخیں ہونا۔ یا چند قوموں کا ایک نسل کی فرع ہونا مانتے تھے۔ اسی طرح اس نے چند مختلف قسم کے جانوروں کا ایک ہی نوع یا چند انواع کے حیوانات کا ایک ہی خاندان کی مختلف شاخیں ہونا ثابت کیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ اس میں اور ہمارے عام خیالات میں تعارض اکثر جگہ ہو گیا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ معارضہ ہی ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم مسئلۂ ارتقا پر غور کریں ؛

مذکورۂ بالا بیان سے میرا مدعا اس کتاب کے مضمون کو عقائد مذہبی کے ساتھ مطابقت دینا نہیں ہے۔ کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی تحقیقات کو مذہب کے مقدس اصول میں شامل کرنا نہایت خطرناک اور دنیاوی اور مذہبی ہر دو حیثیتوں سے مضر ہے۔ اس کے علاوہ آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح میری لیاقت وقابلیت سے بہت زیادہ ذمہ داری کا کام ہے۔ میں نے مسطورۂ بالا سطور میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم پرانے خیالات سے خالی الذہن ہو کر عقائد مذہبی اور تحقیقات علمی کو باہم منطبق کرنا چاہیں تو یہ

کوشش بالکل بے سود نہ ہوگی۔ شاید آپ کہیں کہ جب میں مذہب کو ان باتوں سے الگ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ تو پھر ان دونو کی تطبیق کے کیا معنی۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان باتوں کو عقائد مذہبی سے جدا رکھنا مفید سمجھتا ہوں مگر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ خیالات آہستہ آہستہ ہمارے دماغ پر اپنا اثر جما لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلقہ مذہبی اقوال کی بھی ایسی ہی تاویل کی جانے لگتی ہے جو ان کے مطابق ہو۔ اور نا معلوم طور پر خود بخود ہمارے عقیدوں میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عوام تو عوام اکثر علمائے کرام بھی ان کو اصول مذہب سے ممتاز نہیں کرتے اور ان کو اسی شد و مد سے منوانا چاہتے ہیں۔ جس طرح نہایت اہم اور ضروری ارکان ایمان کو۔ پس ایسے اصحاب کے لئے ضرور ہے کہ اس زمانے میں جبکہ نئے قیاسات پُرانے خیالات کی تردید کر رہے ہیں۔ یا تو وہ ان نئی باتوں کا معقول ابطال کریں۔ یا ان کو بھی مذہبی عقیدوں سے ویسی ہی مطابقت دیں جس طرح پُرانے خیالات کو ہو گئی تھی۔ اگرچہ ان دونو سے بہتر صورت یہی ہوتی کہ ان کو کسی طرح مذہب کے معارض ہی نہ ہونے دیا جاتا۔ یعنی اس قسم کے مضامین کو شروع ہی سے اصول مذہب میں شامل نہ کرتے۔ بہرکیف میں نے اس کتاب کو محض اس کے مضمون کی دلچسپی اور اس کے موضوع کی جدت کی وجہ سے اہل وطن کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔

اس کے ترجمے میں مجھے جو دقتیں نایابی الفاظ کی وجہ سے پیش آئیں۔ میں انہی کو ترجمے کی خامی کے الزام میں اپنا عذر خواہ سمجھتا ہوں۔ اردو زبان میں علوم و فنون کی ڈکشنریوں کے نہ ہونے کے سبب سے مجھے اکثر جگہ خود لفظ وضع کرنے پڑے۔ میں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اتنا خود ستا تو میں نہیں ہوں کہ یہ سمجھنے لگوں کہ میرے وضع کردہ الفاظ جزو زبان بن سکینگے۔ لیکن تاہم یہ تو ہوگا کہ خواہ مخواہ اُن معانی کے ادا کرنے کے لئے ان سے بہتر کوئی اور لفظ وضع ہونگے۔ اور یوں میں اپنے دل کو یہ کہکر خوش کر لونگا کہ بالواسطہ گویا میں ہی اردو زبان کی توسیع کا سبب ہوا گو سبب بعید ہی سہی +

میں نے اکثر جگہ تاریخی ناموں اور تشریح طلب لفظوں کے نیچے مختصر نوٹ دیکر

ترجمے کو زیادہ عام فہم اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے - گو اب بھی کتاب میں بعض مقامات کسی قدر غور کے محتاج ہیں - خاص کر دوسرا باب جس میں آغاز نوع انسان کی بابت علم ہیئت سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں - اس میں ریاضی کے چند مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں - اور چونکہ ان کا سمجھنا ان سے پہلے مسائل کے جاننے پر مبنی ہے - میں نے بھی ان کی زیادہ تشریح نہیں کی - کیونکہ جو اصحاب ان مسائل سے واقف ہونگے ان کے لئے کوکسی توضیح کی ضرورت نہیں - اور جو لوگ ان سے ناآشنا ہیں - ان کو چند سطروں کے فٹ نوٹ کیا فائدہ دے سکتے ہیں - پھر بھی اگر ان مسائل ریاضی کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو باقی باتیں زیادہ مشکل نہیں رہتیں - میں ناظرین کی توجہ اس باب کی طرف خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں - کیونکہ ابواب مابعد کے تمام نتائج زیادہ تر اسی بحث کے اخذ کردہ نتائج کی تاکید کرتے ہیں - اگر اس باب پر تھوڑی سی بھی توجہ کی گئی تو تمام مضمون واضح ہو جائیگا ٭

میرے خیال میں دیباچے کے لئے اتنی باتیں کافی بلکہ اس سے بھی کچھ زائد ہیں - زیادہ تفصیلی بحث کے لئے ناظرین کو متن کتاب کی طرف توجہ کرنی چاہئے - مترجم کو اس سے زیادہ سمع خراشی کی ضرورت نہیں ٭

خاکسار مترجم

Marfat.com

باب اوّل

بدءِ نوعِ انسان کی بابت چند سوالات

بنی نوعِ انسان کی تاریخ کی ابتدا میں اس مضمون کے متعلق چند سوالات ہیں جو طبعاً ہر شخص کے سامنے آتے ہیں۔ اور اس کی توجّہ کو کھینچے رہتے ہیں۔ اگر ان سوالات کو فراموش یا نظرانداز کر دیا جائے تو وُہ بار بار دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔ گویا بے کافی و شافی جواب لئے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ یہ سوالات عالموں کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ شاعروں کے خیال اور فلسفیوں کے دماغ پر اِن کا اثر یکساں ہے۔ اگر کچھ دیر کے لئے بُھلا بھی دئے جائیں تو تھوڑی دیر میں وُہ پھر اور زیادہ زور سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی زمانہ اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں یہ خیالات نہ آئے ہوں۔ کوئی زبان اور کوئی لہجہ ایسا نہیں جس میں یہ سوالات نہ ہوئے ہوں۔ حقیقت میں اُس سے زیادہ نادان کوئی نہیں جو یہ نہیں جانتا کہ آدمیوں نے ان سوالات کا قرین قیاس اور واقعی جواب دینے کے لئے کیا کیا کوششیں اور کیسی کیسی محنتیں کی ہیں ۔

یہ سوالات جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ تعداد میں تین ہیں۔ اوّل تخمیناً یا حقیقتاً کس وقت روے زمین پر نوعِ انسان کا وجود ہوُا؟ دوم کس قطعہ زمین میں ابتداً انسان کا ظہور ہوُا؟ سوم وُہ صورت یا طرز یا طریقہ کیا تھا۔ جس سے انسان اس زمین پر بحالت ہوش و حواس وارد ہوُا۔ یہاں کے اشرف المخلوقات ہونے کا دعوےٰ کیا اور پھر اپنے آپ میں اپنے خیال اور افعال پر غور کرنے کی قابلیت

معلوم کی؟

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ سوالات آسانی سے رد نہیں کیئے جا سکتے۔ یہ بات انسانی طبیعت میں داخل ہے۔ کہ ہم اپنے آغاز وجود کے وقت۔ جگہ اور طرز کی بابت غور اور تحقیق کریں۔ انسان نے فطرتاً ان باتوں کے جواب کے لیئے تمام علوم مختلفہ کو چھان مارا ہے۔ کسی میں یہ خواہش تحقیق کم ہے۔ کسی میں زیادہ۔ مگر ہے سب میں۔ دنیا کے وحشی سے وحشی طبقے میں بھی ایسے فاتر العقل اور بے وقوف کا ملنا دشوار ہے۔ جس میں اپنی فہم ناقص کے مطابق اپنی قوم کی ابتدا اپنے قبیلے کے آغاز اور اپنی پیدائش کے متعلق شوق جستجو تک نہ ہو۔ جب وحشیوں کا یہ حال ہے تو مہذب دنیا کے عقلمند فاضلوں کے شوق تحقیق کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جن کا ذہن رسا آسمان کے تارے اُتارتا ہے۔ اور جن کی نظر بینا زمین کے خزانے دیکھتی ہے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ان نہایت ہی ضروری اور اہم سوالات پر بڑے عجز و نیاز سے غور کیا جائے۔ منصف مزاج محقق کو شروع ہی سے اپنی قابلیت کی وسعت اور اپنے سارے ذریعوں کی محدودیت پر غور کر لینا چاہیئے۔ سچائی اور بے تعصبی اس کے مزاج کا جزو ہوں۔ طلب صادق اس کی رہنمائی کرے۔ یکسوئی توجہ اس کی رہبر ہو۔ متانت اس کے دست و قلم کو سنبھالے۔ خواہش صداقت اس کی ہمت بڑھائے۔ اس کا اصلی منشا اور مدعا یہ ہو کہ اگر ہو سکے تو وہ نوع انسان کے فائدے کے لیئے اُن کے خزانۂ علمی کو ترقی دے۔ اور اپنے نور دماغ سے اس غار تیرہ و تار کو روشن کرے جس کی طرف اتنی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ شاہد صدق کے سچے عاشق اور تحقیق علم کے اصلی شائق کی غرض و غایت یہی ہونی چاہیئے۔ نہ یہ کہ وہ کسی پرانے نتیجے کو اشاعت دے۔ یا کسی چھوٹے سے تعصب کی تائید کرے۔ یا کسی بوسیدہ خیال کی تاکید کرے۔ جو اگلے لوگوں کی کم علمی اور ناواقفیت سے پیدا ہوا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی نہ چاہیئے کہ وہ موجودہ علم و یقین پر حملہ کرے۔ اور ان کو مٹا دے۔ یا زبردستی ان پرانے عقیدوں کو متذبذب اور متزلزل کرے جن کو اس کے بزرگوں کے دل نے اپنے اظہار بیم و رجا کے بہترین

طریقے قرار دیئے ہیں - بلکہ اس کو چاہیئے کہ ہر چیز کا اچھی طرح درست موازنہ کرے اور بالکل خالی الذہن ہو کر ہر ایک خیال و عقیدۂ انسانی اور واقعہ موجودہ پر غور کرے - لیکن آخر آدمی ابتدائے آفرینشِ انسان کے وقت اور جگہ کی بابت کیا خیال کرتا ہے - اور ان حالات اور واقعات کی نسبت کیا رائے رکھتا ہے جس سے ظہور آدم وقوع میں آیا - شاید ان سوالات کے حل کرنے کے لیئے سب سے زیادہ موزون مشابہت ہر فرد بشر کی خود اپنی ابتدائے ہستی کی بابت واقفیت ہے - یہ تشبیہ اور اس کا خیال تعجب ہے کہ اکثر نظر انداز کیا گیا - ہر شخص کا علم خود اپنے متعلق ایسا عام ہوتا ہے - کہ اسے ابتدائے عالم کو اس پر محمول کرنے کا خیال تک نہیں آتا - اگر ہم اپنی زندگی پر نظر ڈالیں اور گزشتہ وقت کے حالات پر ذہن دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں ہم آغاز کی طرف بڑھتے ہیں - یہ حالات دھندلے ہوتے جاتے ہیں یہانتک کہ بچپن کی باتیں بالکل مٹی مٹی معلوم ہوتی ہیں - اور آخر شیر خواری کی حالت میں ایک وقت آتا ہے کہ اس کے آگے ہماری بصارت اور بصیرت بالکل کام نہیں دیتی - غور کرو اور دیکھو کہ عمر کا وہ حصّہ جو ہم ابھی گزار کر آئے ہیں - حافظے کے نور سے روز روشن ہو رہا ہے - اس سے کچھ اور پیچھے ہٹیں تو روشنی ہلکی اور چیزوں کے رنگ پھیکے ہیں - عمر کی دوسری دہائی کا خیال کرتے ہوئے حافظہ اکثر باتوں میں پہلو تہی کرنے لگتا ہے - اور سوائے موٹے موٹے واقعات کے اور جزئیات پر دھندسا چھا جاتا ہے - اس سے پیچھے ہٹیں تو حافظے کا سورج ڈوبنے لگتا ہے - صرف شفق کی روشنی میں کسی کسی بات کی جھلک نظر آتی ہے - مگر وہ بھی اصلی صورت سے مختلف - باپ کا چہرہ - بھائی کا ہاتھ - ماں کی پیاری گود اور بس - اس کے بعد مطلع صاف ہے - اور رات کی تاریکی گہری - ہاں یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے حافظے کی انتہائی پہنچ سے پہلے بھی ہم موجود ضرور تھے - اور دوسروں کی طفولیّت دیکھکر ہم نے جان لیا ہے کہ زندگی کے پہلے دو ڈھائی سال تک ہم بالکل ناسمجھ اور محض بے خبر تھے - یہ وقت صرف نشو و نما کا تھا - نیز بسے تیز عقل اور قوی سے قوی ذہن بھی اس قابل نہیں ہے کہ خود اپنے بچپن کے حالات پر سے تاریکی کے پردے اٹھا سکے - یا اپنے ذاتی تجربے سے بتا سکے کہ وہ ابتدا میں کیا تھا؟

اور اپنے علم و یقین سے دکھائے کہ کیسے کیسے تغیّر و تبدّل کے بعد اس کی روح عالمِ ہستی کی دلفزا فضا کے سیر کے لائق ہوئی تھی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری ابتدائے زندگی کی بے خبری میں بہت سے لوگ ہمارے خبرگیراں تھے۔ ان دنوں میں ہمارے والدین اور آور عزیز بڑی دلچسپی سے ہمارے حالات پر غور کرتے تھے۔ گھر والوں میں ہماری باتوں کے قصّے کہے جاتے تھے۔ ہماری حرکتیں کہانیاں تھیں جن کی بنیاد سچائی اور جن کی دلربائی محبّت تھی۔ کچھ دن بعد ہمارے ہوش سنبھالتے ہی یہ قصّے کہانیاں بار بار اور طرح طرح سے ہمارے کان پڑیں۔ اور جہاں کافی دلچسپ نہ ہوئیں وہاں ہم نے خود ان میں کمی بیشی کر کے ان کو شاعرانہ رنگ میں رنگ دیا۔ اور حافظے نے انکو اپنے بچپن کی دلچسپ یادگار سمجھ کر اپنے سینے میں جمع کیا۔ اس طرح ہر شخص کے گرد بچپن کے نیم رنگ قصّوں اور افسانوں کا ایک حلقہ ہو جاتا ہے۔ جو آئندہ زندگی میں اس کے تغیّر و تبدّل اور نشو و نما کا سب سے زیادہ سچّا اور صحیح بیان سمجھا جاتا ہے۔

مذکورہ بیان سے ہم اپنے قبیلے، اپنی قوم اور آخر اپنی نوع کے متعلق چند مفید اور مناسب نقاط اشتراک و مشابہت اخذ کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کی پوری قدر اُس وقت سے ہوئی ہے۔ جب سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر فرد اپنی نوع کا ایک مختصر نمونہ ہے۔ اس فرد اور نوع کی باہمی مشارکت نے اکثر ایک دوسرے کے حالات پر علمی روشنی ڈالی ہے۔ اس مہتم بالشان کام یعنی تمدّن و تہذیب کے آغاز۔ اسباب شرائط۔ ترقّی۔ اور میلان الے الکمال وغیرہ کی نہایت مفصل اور خاطر خواہ تشریح حالات نوع اور سوانح فرد کے مختلف طبقوں کے مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال فی الوقت ہم کو ان باتوں سے چنداں علاقہ نہیں۔ پس اگر ہم نوع انسان کو ایک فرد بشر قرار دیں۔ جس کی شیر خوارگی بے خبری کے پردے میں چھپی ہوئی ہے جس کا بچپن بہت کم جھلکتا ہے۔ جس کا شباب نمایاں مگر دھندلا ہے۔ اور جس کی کہولت کامل العقل اور سریع الفہم ہے۔ تو ہم کس قدر حالات کی علمیّت اور کس قدر واقعات کی واقفیت کا دعوٰے کر سکتے ہیں۔ جن سے وجود انسانی کی سب سے پہلی حالت اور اس بے خبری کی کیفیّت دریافت ہو سکے جو ہر قوم کی یادداشت کی حد سے باہر اور

ہر شخص کے وہم وقیاس کے دائرے سے پرے ہے۔ کیا تصوّر اور تخیل کے ایسے معتبر ذرائع ہیں۔ جن کو علم کہہ سکیں اور جن سے اس دور دراز سرزمین پر جو انسانی ہوش وحواس کے افق سے پرے ہے۔ تحقیق کی روشنی منعکس کی جا سکے +

نہایت ہی خوش نصیبی کی بات ہے کہ ایسے ذرائع فی الواقع موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر حال ہی کی تحقیق ہیں۔ مختلف علوم و فنون کے میدان انسانی دل و دماغ کے لئے صاف کر دئے گئے ہیں۔ اور ہر بار کی تفتیش ہمارے ان اہم سوالوں کے متعلق نئی اور قیمتی معلومات مہیّا کرتی ہے۔ بہت سے روز افزوں ترقّی کرنے والے علموں کی کوششیں ان نتائج کے لئے وقف ہو رہی ہیں۔ جن کو پھیلانے سے نسل انسانی کی ابتدائی حالتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں زیادہ مفید اور معتبر یہ ہیں۔ علم ہیئت۔ طبقات الارض۔ آثار قدیمہ۔ علم نباتات قدیمہ۔ تشریح الانسان۔ علم الاقوام۔ تہذیب الاقوام۔ قصص۔ سوانح (اس میں پرانے زمانے کی کتب نظم۔ افسانے۔ اور تذکرے بھی شامل ہیں) اور سب کے آخر میں علم تاریخ۔ اور علم السنین

(Astronomy, Geology, Archeology, Palaentology, Anthropology, Ethnology, Ethnography, Tradition, History and Chronology).

شاید نظر اول میں ان مذکورہ علوم کا فائدہ آغاز ہستی کی بابت سمجھنا دشوار ہو۔ مگر ذرا غور کرنے سے اس کی پوری توضیح ہو سکتی ہے +

(۱) علم ہیئت۔ یعنی وہ علم جو اجرام فلکی کے نظامات۔ حرکات اور خصوصیات پر بحث کرتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور ضروری حصّہ نظام شمس کے متعلق ہے۔ جس کا ایک چھوٹا اور ادنےٰ رکن زمین ہے گیلیلیو[1] اور کوپرنکس[2] (Galileo and Copernicus)

---

[1] (۱۵۶۴-۱۶۴۲ء) اٹلی کا ایک نہایت مشہور حکیم اور فلسفی جس نے پینڈولم کی حرکتوں کے مساوی الوقت ہونے کا اصول دریافت کر کے گھنٹے ایجاد کئے۔ دوربین کو بھی اس نے بہت ترقّی دی۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی ۳۲ گنا طاقت کی دوربین سے علم ہیئت اور نجوم کی تحقیقات میں ایک نئی جان پڑ گئی سنہ ۱۶۳۲ء میں اُس نے اپنی مشہور کتاب علم ہیئت پر لکھی جس میں نظام شمسی کے متعلق اُس نے کوپرنکس کی رائے کی تائید کی تھی۔ اسی بنا بر اُس پر الحاد کا الزام لگایا گیا۔ اور مجبوراً اُس کو اپنے عقیدے سے انکار کرنا پڑا جس سے اُس کی جان بچی۔ آخر ۸۔ جنوری سنہ ۱۶۴۲ء کو اُس کا انتقال ہوا +

[2] (۱۴۷۳-۱۵۴۳ء) جرمنی کا مشہور فاضل ہیئت جس نے فضلاء یورپ میں سب سے پہلے نظام شمسی کی بابت بطلیموس کی رائے کو غلط ثابت کر کے فیثاغورث کے خیال کی تصدیق کی +

Marfat.com

کے زمانے سے اب تک یہ علم ترقّی کے بہت سے زینے طے کر چکا ہے۔ جن میں سے سب سے آخری وُہ ہے جسے اصطلاح حال میں۔ ہیئت جدید کہتے ہیں۔ اور جس کی غرض نظام شمس کے اجزا اور حقیقت کی چھان بین کرنا ہے۔ اس عظیم الشان تحقیق کا ایک جزو ترتیب آفرینش کا پتہ لگانا ہے۔ مجازی عبارت اور شاعرانہ طرز ادا کے مطابق جو اس حصّے نے اپنے لئے اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا منشا اجرام سماوی کی پیدائش۔ طفولیّت۔ شباب۔ کہولت۔ پیری اور موت کے متعلق ہے۔ ان مراتب کی خاطر خواہ تحقیق کی جا چکی ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے۔ کہ ایک ایک سیارہ اپنی ابتدائی حالت سے حالت ارضیت تک کے تغیّرات میں ان تمام مراتب کو طے کرتا ہے۔ یہ بات اچھّی طرح واضح اور ثابت ہو گئی ہے۔ کہ وہ عجیب و غریب شے جس کا نام زندگی ہے۔ صرف خاص خاص مراتب نجمی میں پائی جاتی ہے۔ اور اس کا وجود ان مراتب کے وجود پر مبنی ہے۔ صاف لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ سیّاروں کے عالم طفلی میں وہاں زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسی حالت میں بعض ایسے اسباب موجود ہوتے ہیں۔ جن کے ہوتے زندگی کسی صورت میں بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک سیّارہ میں درست قابلیّت ارضیّت حاصل ہونے سے پہلے بہت سے تغیّر و تبدّل ہوتے ہیں۔ جن میں حیات کی کوئی طرز بھی ممکن نہیں ہوتی۔ آخرالامر ایک خاص حالت میں بعض اشیا پیدا ہوتی ہیں۔ جن کو زندہ یا ذیحیات کہہ سکتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس طبقے سے ذرا اور ترقّی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نئی دنیا میں ایسے جاندار پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اس کی سطح کو بساتے ہیں۔ اس کے پانی میں تیرتے ہیں۔ اور اس کی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ یعنی جو عرف عام میں بھی جانور کہلانے کے مستحق ہیں۔ یوں ہم تاریخ کواکب کے اس رتبے تک پہنچتے ہیں۔ جسے عالمِ حیات کہتے ہیں۔ عالم حیات کے درجہ ترقّی میں نوع انسان کی طرح عقلمند جانوروں کا وجود امکان رکھتا ہے۔ اور پھر ایک مدّتِ دراز تک یہ سیّارہ اُن ترقّی یافتہ جانوروں کا مسکن رہتا ہے۔ جو ہماری طرح عقل تمیز اور ہوش رکھتے ہیں۔ اور اشرف المخلوقات ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ مدت حیات مختلف سیّاروں

ہیں مختلف ہوتی ہے - علم ہیئت اس مدت کے پرے کے حالات کا قیاس کرنے سے نہیں رکتا - اور صاف بتاتا ہے کہ کچھ دن بعد حالت ارضیت ضعیف ہو جاتی ہے - اور اس سیّارے کے جاندار نابود ہوتے جاتے ہیں - گویا وہ سیّارہ مرجاتا ہے - اب یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ جہاں تک یہ تحقیق قیاس صحیح - اور واقعات موجودہ کے علمی نتائج خود ہمارے سیارۂ زمین کی حالت ارضیت کے آغاز اور انجام کا سراغ لگانے میں مدد دیں وہیں تک علم ہیئت نوع انسان کی قدامت - اس کے زمانۂ بے خبری کی طوالت اور اس کے ابتداے آفرینش کے وقت کے معلوم کرنے میں ایک مفید اور عمدہ ذریعہ ہے +

(۲) علم طبقات الارض - جہاں علم ہیئت حیات کونی اور حیات بشری کی بحث تمام کرتا ہے - وہیں سے وسیع اور معتبر علم طبقات الارض اس مضمون کو شروع کرتا ہے - علم اوّل الذکر تمام ستاروں اور اُن کے باہمی انتظام پر حاوی ہے - مگر دوسرا علم صرف ہماری زمین ہی کی بابت تحقیق کرتا ہے - اس کی غایت یہ ہے - کہ ان تمام کیفیات کا سراغ لگاے جو اس زمین پر ہیولاے ابتدائی سے الگ ہونے سے لیکر اب تک گزری ہیں - اس تفتیش کے ضمن میں حیات ارضی کی تمام مختلف طرزوں کی مادی حالتیں بھی آجاتی ہیں - کیونکہ زندگی کی ہر صورت حالات و کیفیات ارضی سے وابستہ ہے - اگر طبقات زمین کا پورا علم یعنی اس سیارے کے مختلف تغیرّات کی صحیح تاریخ دریافت ہوسکے تو ابتداے حیات کی صحیح جگہ معلوم ہونا چنداں دشوار نہیں ہے +

تغیرات ارضی کی تاریخ کے مختلف درجے عالم زندگی کی تاریخ کے طبقوں سے ہم قدم ہوتے ہیں - اور عالم زندگی میں نوع انسانی کا درجہ اس سیارے کی مادی کیفیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے - اس عالم کے ہر طبقہ والے صفحۂ زمین پر اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں - جو زمانہ آیندہ کے ذہنوں اور عقلوں کے لئے گویا تحریر کا کام دیتے ہیں - اور بتدریج آنے والے جانداروں کی ابتداے ہستی اور تغیرّ و تبدّل یا ترقّی و تنزّل کے گوناگوں مدارج کے وقت ظہور اور حالات وقوع پر شاہد صادق ہیں +

(۳) علم آثار قدیمہ۔ جو تعلق علم طبقات الارض کو ہئیت سے ہے وہی آثار قدیمہ کو طبقات الارض سے ہے۔ عالم حیات کے وجود اور نتیجے کی جو شہادتیں طبقات زمین یا اجرام فلکی سے ملتی ہیں۔ وہ اگرچہ واضح اور نمایاں تو بہت ہیں مگر خود ان رہنے والے جانداروں کی پس ماندہ نشانیاں نہیں ہیں۔ اس سے مذکورہ علوم ان کو نایاب اشیا کے وجود ماضی کی دلیل گردانتے ہیں۔ لیکن ان علامتوں اور نشانوں کے علاوہ خود ان جانداروں کے ڈھانچے وغیرہ بھی ملے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس زمین پر رہتے سہتے تھے۔

ہماری اپنی نسل نے بھی اپنا ورثہ چھوڑا ہے۔ زمین انسانی یادگاروں (بقیوں) سے بھری پڑی ہے۔ کیونکہ آدمی بھی جہاں کہیں بسے وہیں اپنی نشانیاں چھوڑ گئے۔ اس اعلےٰ درجے کے عقلمند اور باتمیز طبقہ حیوانات میں جس کی ہم خود ایک زندہ مثال اور سچا نمونہ ہیں۔ یہ بات فطری تھی کہ اس کے افراد اشیائے قدرتی کو لے کر درست کرتے اور اپنے لئے کارآمد بناتے تھے اور نقل مکان کرتے ہوئے یا مرتے ہوئے یہیں پھینک جاتے تھے۔ اس طرح زمین کا کوئی طبقہ اور کوئی حصّہ انسانی یادگاروں سے خالی نہیں۔ اور ان میں سے اکثر ایسے مادوں کی بنی ہوئی ہیں جن کا مٹنا ہزاروں برسوں میں بھی مشکل ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ موجودہ نسل انسانی ان پرانی نشانیوں کو پہچاننے میں دھوکا کھائے۔ کیونکہ ان سب کی بناوٹ سے ایک خاص لیاقت اور نمایاں عقل ظاہر ہوتی ہے۔ جو ان کو اور جانداروں کے بقیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ باقیات صالحات انسانی کی تفتیش اسی صدی میں شروع ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ علم کا وہ کشادہ اور فراخ میدان ہے۔ جسے ارکیالوجی یا آثار قدیمہ کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق زمانۂ جدید سے ہے اور دوسری کا زمانۂ قدیم سے۔ یہاں ہماری مراد زمانہ جدید سے وہ زمانہ ہے جبکہ مختلف اقوام انسانی کم و بیش اپنے حالات وخیالات کو نقش ونگار یا عمارات و مینار کی صورت میں ظاہر کرنے لگیں۔ اور جس کو نوع کی طفولیّت کہہ سکتے ہیں۔ اور زمانہ قدیم سے وہ وقت جو حافظہ انسانی کے دھندلے سے دھندلے خیال سے بھی پرے واقع ہے۔ اور جبکہ ہمارے آباؤ اجداد

خواب غفلت میں پڑے تھے +

اپنے اصول اور طرز تحقیق میں یہ علم انسانی صناعیوں کے ساتھ خاص ہے۔ جن پر ان کے آس پاس کے طبقات زمین کے لحاظ سے غور کیا جاتا ہے۔ انسانی دستکاری کا ہر ایک نمونہ ان قدیمی نباتات اور حیوانات کے بقیوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ جن کی ترتیب اور تدریج علم طبقات الارض پہلے ہی معلوم کر چکا ہے۔ اس سے خود ان کی بابت بھی اندازہ کرنے میں چنداں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ اس علم کا اصل اصول یہ ہے کہ ترقی انسان کے مختلف طبقوں کی صنعت گری اور دستکاری میں اور اس سرزمین کی تاریخ میں جہاں وہ پائی گئی ہیں۔ ایک خاص وابستگی اور تعلق ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ علم ابتدائے آفرینش نوع کے محقق کے لئے کس قدر بیّن اور معتبر شہادتیں مہیّا کرتا ہے +

(۴) علم نباتات قدیمہ یہ علم آثار قدیمہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اور اس کی غرض یہ ہے۔ کہ اس دنیا کے قدیم اور نایاب نباتات اور حیوانات کی بناوٹ۔ طرز وروش اور جماعت بندی کے متعلق دریافت کرے۔ یہ علم ان کو ان کے زمانہ وقوع وظہور کے لحاظ سے درجہ بدرجہ منقسم اور مرتب کرتا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ زندگانیٔ حیوانی اور حیات نباتی میں ایک خاص تعلق ہے۔ اور یہ کہ جاندار اشیا کا انحصار بے جان چیزوں پر ہے۔ اس تحقیق کے لئے نہ صرف زمین کی سطح بلکہ اندر کا پرت تک بعض جگہ سے کھود کر تفتیش کا حق ادا کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ارکیالوجی کی طرح (جس کی یہ علم ایک فرع ہے) یہ بھی آخر میں طبقات الارض ہی پر موقوف اور منحصر ہے۔ آگے چلکر اس علم کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ علم حیوانات یا (Zoology) اور علم نباتات یا (Botany) کیونکہ یہ دونوں زمانہ قدیم کے حیوانات اور نباتات کی بدلی ہوئی صورتیں اور بگڑے ہوئے نمونے ہیں۔ اس علم کی تحقیقات بھی اکثر جگہ انسان کے وجود اور حالت کے ابتدائی زمانے کے بیان سے ٹکراتی ہے۔ کیونکہ یہ علم انسان کو حقیقت میں ان جانوروں کا ترقی یافتہ اور مکمل نمونہ قرار دیتا ہے۔ جن کی قدامت چٹانوں میں اور جن کی آج کل کی تگ ودو ہماری خشک زمینوں اور گہرے سمندروں پر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ علم بھی انسان

قدیمی کے ہمعصر جانوروں کی بحث اور کبھی کبھی خود آفرینش انسان کے زمانے کا ذکر کر کے ہمارا ہاتھ بٹاتا ہے +

(۵) علم تشریح الانسان - یہ پانچواں علم ہمارا ایک نو پیدا شدہ معاون ہے - یہ اتنا نیا ہے کہ ابھی اچھی طرح اس کی تشریح اور توضیح بھی نہیں ہونے پائی - یہ انسان کو تاریخ قدرت (Natural History) کا ایک جزو سمجھتا ہے - اور سب سے پہلے اس کی مادی اور جسمانی کیفیت پر غور کرتا ہے - اور اس کو ایک قسم کا جانور مان کر اس کی شکل و شباہت - خو - بو - طرز و روش اور باہمی تعلقات پر بحث کرتا ہے - اس طرح علم طب (PhysioLogy) اور تشریح الابدان (Anatomy) اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں - لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نیا علم انسان کی دماغی اور اخلاقی حالت کو بھی لیتا ہے - اور تمام تغیرّاتِ قلبی اور ان اصول و امور کی تحقیق کرتا ہے - جن کو علمی اصطلاح میں علم النفس (Psychology) کہتے ہیں +

یہ علم گزشتہ حالات پر غور کر کے تاریخ کا ایک معاون بن جاتا ہے - کیونکہ یہ اُن تمام مختلف درجوں اور زینوں کی تحقیق کرتا ہے - جو انسان طے کر آیا ہے - یہ نوع کی ابتدا کا سراغ بھی لگاتا ہے - یہاں تک کہ آثار قدیمہ کی حد سے جا لگتا ہے - اور اس علم کے ساتھ زمانہ قدیم کی انسانی یادگاروں میں حصّہ بٹاتا ہے - اور اس تقسیم کی صورت یہ ہے کہ افعال انسانی کی یادگاریں آثار قدیمہ کو مل جاتی ہیں اور ذات انسانی کے بقیّے اس علم کے ہاتھ لگتے ہیں - اور اس طرح دونوں علم ایک دوسرے کے ہمدست و ہمداستاں ہو جاتے ہیں +

اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کے انسانی بقیّے اب تک پائے جاتے ہیں یہ اکثر ہڈّی کی قسم سے ہوتے ہیں - اور بآسانی ان چیزوں سے جدا کئے جا سکتے ہیں - جو انسانی صنائع کا نتیجہ ہیں - مثلاً انسانی اوزار - برتن - یا پہننے کی چیزیں - گو یہ سچ ہے کہ زمانہ قدیم کے آدمی کی کھوپڑی یا کوئی اور ایسی ہی ہڈّی اور اس کی مستعملہ پتھریا کانس کی کدال اس کی قدامتِ وجود اور ایک حد تک اس کے زمانہ وجود کی کافی دلیل ہیں - مگر حقیقت میں غور کیا جائے - تو یہ دونوں بالکل مختلف علموں کے متعلق ہیں - ایک خود ساخت انسانی کا جزو ہے -

اور دوسری گویا اس کی تہذیب کا ایک نمونہ۔ ایک اس علم کے متعلق ہے۔ اور دوسری تاریخ آثار قدیمہ کے متعلق۔ یہ بات صفحات آیندہ میں واضح ہوگی کہ اس علم نے کہاں تک انسان کے آغاز ہستی پر روشنی ڈالی ہے +

(۶) علم الاقوام۔ یہ علم ایک حیثیت سے مذکورۂ بالا تحقیقات کی ایک شاخ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ نوع انسان کی مختلف قوموں۔ خاندانوں۔ اور نسلوں کی خو بو۔ طرز انداز۔ میل جول اور حسب نسب اور عام خصوصیات کی بابت مطالعہ کرے۔ وہ حالات جسمانی جو نوع انسان پر اثر ڈالتے رہے ہیں۔ وہ مدارج تہذیب جو اس نے طے کئے ہیں۔ وہ تمدّنی زندگی کے مختلف پہلو جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور ترقّی کے وہ قدرتی قانون جن کے موافق ہماری نوع اُس ابتدائی حالت سے اس انتہائی حالت تک پہنچی ہے۔ یہ تمام مسئلے اس علم کے زیر بحث ہیں +

اس کی ابتدا ان دستکاریوں سے ہوتی ہے۔ جو قدیمی انسان کی نہایت ہی سادہ طرز زندگی کی ادنےٰ ضرورتوں اور پست ترین حاجتوں کے لئے کافی تھے۔ اور اس کی انتہا ان صناعیوں پر پہنچتی ہے۔ جو آجکل کے موجدوں کی نہایت ہی جانکاہ محنتوں اور نہایت ہی نازک کوششوں کے لئے آلات فراہم کرتی ہیں۔ یہ علم اپنے عمل میں بڑی محنت اور بڑا تحمل چاہتا ہے۔ اس کا احاطہ بھی بہت وسیع ہے۔ کیونکہ انسانی تمدّن کا کوئی شعبہ اس کی تحقیق سے بچا ہوا نہیں۔ کبھی یہ اس بات پر غور کرتا ہے کہ ابتداءً انسانی زندگی دنیا میں کس قسم کی خوراک سے قائم رکھی گئی۔ اور کبھی یہ کہ مختلف اقوام انسانی نے توالد و تناسل کے لئے اتحاد زن و مرد کے متعلّق کیا کیا رسم و رواج اختیار کئے۔ اور کیونکر تعلّق زناشوئی کے قاعدے اور قانون وحشیانہ رنگ سے مہذّبانہ لباس میں آئے۔ کبھی یہ زبانوں کے مسئلے کو لیتا ہے۔ اور ان تمام زبانوں کے اختلاف کو سوچتا ہے۔ جن میں کہ انسانی قوموں نے اپنے خیال۔ عقیدے اور آرزوئیں ادا کی ہیں۔ حکومت اور ان تمام ملکی اور تمدّنی قانونوں پر بحث کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ جو انسان کے لئے تجربے اور عقل صحیح نے مختلف وقتوں میں باہمی معاشرت اور مشارکت کے لئے وضع کئے

ہیں۔ اور سب سے آخر میں یہ مذہبوں کی چھان بین کرتا ہے۔ جن کی صورتوں کی گوناگونی کی یہ کثرت ہے۔ اور اس کثرت پر بھی اکثر باتوں میں شرکت ہے۔ اور جن سے روح انسانی کے بیم و رجا اور عقیدے اور مدعا ظاہر ہوتے ہیں۔ جب کہ وہ اس دار ناپائدار سے بیزار۔ اور ملک ابدی کی آرزو میں بیقرار ہوتی ہے۔ اس طرح اس علم کی تحقیقات سے بھی آدمی ان راستوں کو دیکھ سکتا ہے۔ جن سے انسان اپنی ابتدائی حالت سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اور یوں بالواسطہ اس کے ابتدا کے وقت اور حالات کی تحقیق ہوتی ہے +

(۷) علم تہذیب الاقوام۔ علمائے حال نے تجویز کیا ہے کہ علم الاقوام کے اس حصے کو جو قوموں کی عادات و رسوم اور قانونوں پر بحث کرتا ہے۔ اصلی علم سے الگ کر کے تہذیب الاقوام یا اتھنا گرافی نام دیں۔ ایک کا کام محض بیان ہے۔ دوسرے کا منشا اس کی تشریح و توضیح ہے۔ پہلا حصّہ انسانی عادات و رسوم کا صرف ذکر کرتا ہے۔ دوسرا ٹکڑا ان باتوں کی فلسفیانہ توجیہہ و تاویل کرتا ہے۔ ان دونوں میں ویسا ہی تعلق ہے۔ جیسا جغرافیہ اور طبقات الارض میں۔ اگرچہ فرق ایسا نمایاں اور واضح نہیں ہے۔ لیکن تہذیب الاقوم کا مطالعہ علم الاقوام کی نسبت زیادہ آسان اور سطحی ہے۔ انسانی زندگی کی اشیا مل جائیں۔ تو ان کو ان کے متعلقہ مضامین کی حیثیت سے مرتّب کرنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن ان مہتم بالشان واقعات کی تفصیل کے لئے جن میں مختلف اقوام انسانی کی تاریخ کا ماخذ ہے۔ زیادہ وسعت نظر اور قابلیت تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ پس جہاں تک علم تہذیب الاقوام مختلف انسانی قوموں کے حالات اور ان کے باہمی مباینت کے واقعات بیان کرتا ہے۔ وہیں تک یہ ہماری تحقیق میں ہماری مدد کرتا ہے +

(۸) قصص و سوانح۔ اس طرح آخر مختلف علوم عالم کو دیکھتے بھالتے ہم تاریخ ارضی سے تاریخ انسانی تک پہنچتے ہیں۔ ہر فرد کی زندگی کی طرح قوم اور نسل کی زندگی میں بھی آخر ایک وقت آتا ہے۔ جب اس کے قوائے دماغی کام کرنے لگتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرد کی زندگی میں اس وقت کے آتے ہی وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنے واقعات و حالات پر غور کرنے اور ان کو کچھ کچھ یاد رکھنے

لگتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قوم کی زندگی میں بھی اس وقت سے اس کے باہمی واقعات پر ایک طرح کی بحث و گفتگو ہونے لگتی ہے۔ جس کو ہم قصص و سوانح کہتے ہیں۔ آدمیوں کا وہ مجمع ایک قوم بن جاتا ہے اور خود اپنے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ اور قوم کے سب سے زیادہ عقلمند اور تیز ذہن افراد روزمرہ کی باتوں اور پرانی کہانیوں سے پہلے کچھ بے جوڑ اور بعد میں ایک سلسلہ وار حالات مرتب کرتے ہیں ✦

اس طرح قصص و سوانح زندگی قوم کے ہوش میں آنے کا پہلا ذکر ہوتے ہیں۔ اور یہ ذکر آور ہر قسم کے علمی تذکروں سے مقدم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ سب سے پہلے انسانی داستان گو نے نظم کو استعمال کیا ہو۔ مگر مضمون ضرور اس کا ذکر ماضی ہی ہوتا ہے۔ اور یوں انسانی زندگی کا بیان شروع ہوتا ہے۔ یقیناً پہلے حالات خود ان کی اپنی قوم سے خاص ہوتے ہیں۔ اور فسانہ گوئی کی طاقت پورے زور سے کام کرتی ہوتی ہے۔ سچے جھوٹے ہر قسم کے حالات گڈمڈ ہوتے ہیں۔ غرض اس قومی صبح کا مورّخ حکیم اور گویا تذکرہ نویس اور داستان گو وغیرہ سب کی معجون مرکب ہوتا ہے۔ مگر اس کا ہر ایک قول قومی دماغ میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ یہ بالکل صحیح اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اور پیچھے آنے والے شاعر و تذکرہ نویس اسے سند سمجھتے ہیں۔ اور حالات کا دفتر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض باریک بین مصنّف اس میں کاٹ چھانٹ بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر حقیقت کو کہانیوں سے الگ کرنے کے لئے عمریں چاہئیں۔ آخر آدمی ترقّی کرتے کرتے تہذیب اور تعلیم کے اعلےٰ پائے تک پہنچتے ہیں۔ قوائے دماغی اور بہت سے علموں کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ مختلف قومیں ایک دوسرے پر اثر کرتی ہیں۔ ملکی اور سیاسی امور کا جال جنجال بن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر پرانے زمانے کی تاریخ کے بناوٹی قصے اسی طرح زبان زد رہتے ہیں۔ اور باقی حصے کو بھی رنگین رکھتے ہیں۔ مگر قصص اور سوانح میں فرق کیا ہے۔ کیا یہ دونوں متحد نہیں ہیں۔ کیا ان کا ٹھیک فرق واضح کرنا ممکن ہے۔ کیا ان دونوں انسانی دماغ کے نتیجوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے ان پر غور کر سکتے ہیں؟ ہاں یہ ممکن ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی شے نہیں

Marfat.com

ہیں - مگر پھر بھی یہ ایک دوسرے سے اتنی وابستہ اور چسپیدہ ہیں کہ ان کا ممتاز کرنا بھی آسان نہیں - قصّے گزشتہ امور کے وہ تذکرے ہیں - جو نسلاً بعد نسلِ انسانی حافظے اور گفتگو کے ذریعے سے زبان زد ہوتے آئے ہیں - ان کا وجود انہیں طاقتوں پر مبنی ہے - اور ان کی بقا بار بار دوہرانے پر منحصر - اگر یہ قصے حوالۂ قلم بھی کر دئے جائیں تو بھی اُن کی حالت میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور یہ سوانح کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اگر واقعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک بھی زبان زد رہا ہے تو پھر اس میں قصّے کی خصوصیات راسخ اور ناقابل محو ہو جاتی ہیں +

اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ قصوں کا اعتبار اس وقت کے لحاظ سے ہوتا ہے - جو وقوع واقعہ سے لیکر قصہ کے قلمبند کئے جانے تک گزر چکا ہے - اگر یہ وقت زیادہ ہو تو قصّہ بالکل قابل اعتبار نہیں - کیونکہ جب تک کوئی بات صرف انسانی یادداشت اور بیان پر مبنی ہو - تب تک وہ کسی طرح کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ سے بچ نہیں سکتی - لیکن اگر یہ تھوڑے ہی دن یا زیادہ سے زیادہ ایک پشت بعد تحریر سے مضبوط کر دی گئی ہے - تو وہ حقیقی تاریخ کے قریب قریب ہی معتبر خیال کی جا سکتی ہے +

یہاں طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقع میں ہر ایک تاریخ اور تذکرہ انجام کار قصّوں پر مبنی نہیں ہے ؟ فی الحقیقت خواہ واقعہ کتنا ہی قریب الوقوع کیوں نہ ہو اسکی تاریخ کا مصنّف کے دماغ میں سے گزرنا لازمی اور لابدی ہے - اور اسی واسطے اس کا آدمی کی ذاتیات سے متاثر ہونا بھی ضروری ہے - لیکن اگر مصنف نے کوئی چشم دید واقعہ راست راست بے کم و کاست قلمبند کیا ہے تو غلطی کا احتمال اتنا کم ہے کہ نظرانداز کیا جا سکتا ہے - مگر واقعی تاریخ کے لئے صرف مصنّف کا معائنہ اور راست بیانی ہی کافی نہیں - بلکہ اور بھی کئی خوبیاں ہونی چاہئیں - آج کل اس اہم کام کی تعریف میں نئی نئی شرائط بڑھائی جاتی ہیں - جن سے تاریخ کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے - سب سے بڑی خوبی مصنف کے لئے یہ ہے کہ اس کے اپنے ذاتی خیالات طاقعے

Marfat.com

پر مطلق رنگ نہ چڑھائیں۔ اور وہ خود اپنی کتاب میں اتنا ہی نامعلوم رہے۔ جتنا کہ شیکسپیر ہیملٹ میں۔ اس میں شک نہیں کہ مورخ اظہار واقعات کا واسطہ ہے۔ مگر اس بیان پر اس واسطے کا مطلق اثر نہ پڑنا چاہیئے۔ عکسی تصویر کے لئے فوٹوگرافک کیمرا لازمی ہے۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ تصویر میں اس کیمرے کی بھی صورت ہو۔ نقش میں نقاش کے ہاتھ۔ آنکھ اور برش کی ضرورت ہے۔ مگر کیا نقش میں ان میں سے بھی کسی چیز کا نقش ہوتا ہے؟ نہیں۔ پس بعینہ یہی حال مؤرخ کا بھی ہونا چاہیئے۔

لیکن ہم نفس مضمون سے دور جا رہے ہیں۔ یہاں قصوں اور تذکروں کا فرق دکھانا مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ یہ جتلانا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ابتدائے آفرینش کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ اور یہ کام قصّوں کا ہے۔ پرانے آدمیوں کا دماغ اپنی ابتدائی حالت کے دھندلے نقشے سے بھرا ہوا تھا جو خواب کے مضمون سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ اور جس کا خاکہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی کہاوتوں اور بڈھوں کے گیتوں سے کھینچا تھا۔

قدیم زمانے کے انسان خاموشی پسند نہ تھے۔ اور گو بعض قومیں نسبتاً ایسی لسّان نہ تھیں مگر اکثر ترقّی یافتہ اور ذہین فرقے اس قدر پُرگو ہوتے تھے کہ شاید آج کل انہیں بکواسی کہتے۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو میں اکثر ابتدائے آفرینش کا ذکر چھڑ جاتا ہوگا۔ اور یہی گفتگو آگے چل کر ان قصّوں کا مضمون بن گئی۔ کیونکہ وہ لوگ بھی بچّوں کی طرح اپنی نسل کی ابتدا کا پتہ لگانے کے دلدادہ اور خواہاں تھے۔

اس کے علاوہ ان کی نئی نئی دماغی طاقتوں کے سامنے قدرت کا میدان وسیع پڑا تھا۔ جس میں انسان کے سوا اور ہر چیز بھی دلچسپ اور تشریح طلب تھی۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہُوا کہ کہانیوں۔ افسانوں اور قصوں کا ایک انبار جمع ہوگیا اور پھر ان میں اقوام اور افراد کے مختلف تصورات سے ایک عجیب گوناگونی پیدا ہوگئی۔ ہاں اس ایک بات پر البتہ سب متفق تھے۔ کہ انسان کی پیدائش کے وقت۔ جگہ اور کیفیّت کی کچھ نہ کچھ تفسیر ضرور کرنی

Marfat.com

چاہیئے۔ اس بات پر بھی سب متحد تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی پیدائش ضرور ہوئی اور ہر ایک کی نظروں میں زمین اور آسمان کی وہ حالت چھا رہی تھی جس میں انسان کا وجود معدوم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ہر قوم نے خود اپنے قیاس۔ اپنے بزرگوں کے قول اور واقعات موجودہ کی مناسبت کے لحاظ سے آغاز انسانی کے متعلق کچھ نہ کچھ قصّہ بنا کر دل کی تسلّی کرلی۔ اگرچہ ایک حیثیّت سے ان میں سے ہر قصّہ ایک نئے انداز اور ایک نرالے ڈھنگ کا تھا۔ مگر ان میں بعض باتیں مشترک بھی ضرور تھیں اور یہی مشترک باتیں زمانۂ جدید میں بھی ایک مدت مدید تک مسلم اور مستند مانی جاتی رہیں +

اس بیان سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قصّوں نے ابتدائے زمانۂ قدیم کے متعلق انسانی دل ودماغ پر کتنا گہرا اثر کیا ہے۔ آج کے دن تک بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمام عقل وقیاس انسانی ان قصّوں کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ اس لئے ان اہم سوالات کی تفتیش وتحقیق کرتے ہوئے ہم قصّوں کو کسی طرح نظرانداز نہیں کرسکتے +

اس کے آگے تذکروں اور تاریخ کا میدان ہے۔ جس طرح تذکرے انسان کے دماغی کاموں میں سب سے مقدم اور سب کے پیشرو تھے۔ اسی طرح اب تاریخ سب علوم سے موخر اور سب کے نتائج کی نگران اور ترتیب دینے والی ہے۔ اور پہلے کی طرح اب تک بھی ان سوالوں کے جواب کا بار اُسی کے سر پر ہے۔ اس کی بلند پروازی نے تمام علوم عالم کو اپنے پروں کے نیچے لے رکھا ہے۔ گویا ان میں سے ہر ایک اس کے لئے سامان مہیا کرنے میں کوشاں ہے۔ سچّی تاریخ حقیقت میں ان تمام باتوں کا ماحصل ہے جو انسانی دل ودماغ میں گزری ہیں۔ اور جو انسانی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر یہ کامل ہو جائے۔ تو نہ صرف انسان کے آغاز کا عقدہ حل ہو جائے۔ بلکہ انجام کا بھی حال کھل جائے۔ فی الوقت ہم مقر ہیں کہ ہماری کشش وکوشش آغاز کا ہی کچھ زیادہ پتہ نہیں لگا سکتی انجام تو دور ہے۔ اور نہ ابھی امید ہے کہ یہ علم العلوم ان دونوں طرفوں میں کچھ بہت آگے بڑھ سکے۔ ہاں آغاز کی بابت جس قدر واقفیت ہماری عقل اور

Marfat.com

ہمارا ذہن مہیا کر سکتا ہے۔ وہ ناظرین کی خدمت میں ہے +

(۹) کرونالوجی یا علم السنین - یہ علم بھی تاریخ عام کا ایک جزو ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس علم کا ماحصل اور نتیجہ ہے۔ اصطلاح قدیم میں وقت کے معیار کو کرونالوجی سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن اصطلاح علمیہ حال کے مطابق اس سے "تاریخ عالم کے ترتیب واقعات کا لحاظ رکھنا" سمجھا جاتا ہے۔ اس کا کام یہی نہیں ہے کہ خاص امور کی ٹھیک تاریخ وقوع دریافت کرے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کی باہمی ترتیب کی بھی تحقیق کرے۔ فی الواقع یہ ترتیب اور مختلف باتوں کے ہونے کے درمیانی عرصہ کا لحاظ علم تاریخ کا بڑا ضروری حصہ ہے۔ ہمارے بزرگان نوع اپنے اکثر نہایت دلچسپ بیانوں میں اس ترتیب کو مدنظر رکھتے تھے۔ مگر چہ ٹھیک تاریخ لکھنا بھول جاتے تھے۔ اس سے اس فن کی جدت میں کلام پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اس کے طبعی اور فطری ہونے کا ثبوت ملتا ہے +

اس علم کا مبنی اجرام سماوی کا دور ہے۔ جس میں سب سے مقدم کرۂ زمین کی محوری اور شمسی گردش ہے۔ محض وقت کا تصور بیرونی اشیا کے لگاؤ کے بغیر اتنا دشوار ہے کہ نظر اوّل میں اس کی دشواری خیال میں بھی نہیں آتی۔ زیادہ صاف الفاظ میں ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ بے دن رات۔ ماہ و سال وغیرہ کو ذہن میں لائے اُس شے کا تصور کریں جسے عرف عام میں "وقت" کہتے ہیں۔ تو یہ بات تقریباً ناممکن ہوگی۔ شاید یہ مثال اس کی توضیح کرے کہ گو ہر بینا شخص روشنی کو جانتا ہے۔ مگر فی الحقیقت اگر ہم چاہیں کہ بے ان مادی چیزوں کے خیال کے جن کو ہم روشنی سے دیکھتے ہیں۔ خود روشنی کو ہی دیکھیں یا تصور کریں تو یہ بات آسان نہ ہوگی۔ بہرحال ہم کو ان ذہنی الجھنوں اور دماغی بھول بھلیوں میں پڑنے کی زیادہ حاجت نہیں۔ کیونکہ ہمارے کرہ کی گردش اور ان انقلابات کے دیکھنے سے جو اس گردش کی وجہ سے اجرام فلکی کے مقاموں میں نظر آتے ہیں۔ ہم وقت کو آسانی سے ماپ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس علم کا

احسان نہیں تو تمام گزشتہ کاروبار انسانی ایک عجیب بے ترتیبی اور تذبذب کی حالت میں خلط ملط نظر آئیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ یہ ترتیب مدنظر رکھی جاے۔ اور اس کی ابتدا ابتداے آفرینش انسان سے کی جائے۔ اگر ہم کو وہ ابتدا ٹھیک معلوم ہوجائے تو پھر کچھ مشکل نہیں رہتی۔ بلکہ صرف واقعات مختلفہ کو مرتب کرنا رہجاتا ہے۔ مگر چونکہ اصل سوال ہی ابتداے آفرینش انسان کی تحقیق ہے۔ اس سے ہم کو تمام مذکورۂ بالا مختلف اور وسیع علموں کی مدد کی ضرورت ہوئی۔ تاکہ ہم اگر قطعی نہیں تو کم از کم کسی قدر تخمینًا ہی اس زمانے کا پتہ لگائیں۔ جس سے تمام کاروبار انسانی کی ابتدا اور اس کرۂ زمین کی آبادی کا آغاز ہوتا ہے ٭

باب دوم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم ہئیت کی تحقیق

ہم پچھلے باب میں مجملاً ان علوم کا ذکر کر آے ہیں۔ جو ہماری موجودہ تحقیق میں مفید اور آئندہ نتائج کے ثبوت ہیں یہ ظاہر ہے کہ اکثر ان علموں کی شہادت اور افادت بالواسطہ ہوگی نہ براہ راست۔ کیونکہ سواے طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی چند باتوں کے باقی تمام انسانی تحقیقات جواب تک آغاز ہستئ انسان کی بابت کی گئی ہے۔ وہ بطور نتائج اخذ کی گئی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے گویا ہم بلندی پر ایک آئینہ کھڑا کریں جس میں دور افق کے نیچے کی چیزیں منعکس ہوں۔ اور باوجود ان تمام علموں کی اعانت کے ہماری حالت ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص اڑتی ہوئی ریل کی کھڑکی میں سے دور کے درختوں اور جھاڑیوں۔ میدانوں اور پہاڑیوں کو بھاگتا ہوئے دیکھے ٭

بہر حال حیات ارضی اور حیات انسانی کے متعلق ہمارا موجودہ علم ان لوگوں

Marfat.com

کی طرح ہے۔ جو بچپن میں ہماری ہر بات کی بابت دیکھا کرتے تھے +

اگرچہ بعض حیثیتوں سے ہمارا علم اپنی پیدائش کے وقت اور جگہ اور اپنے بچپن کے حالات کے متعلق ہمارے اس علم سے جو ہم ان تمام علوم و فنون کی مدد سے آغاز نوع کی بابت رکھتے ہیں۔ زیادہ واضح۔ صحیح اور تسلی بخش ہے۔ مگر بعض اور لحاظوں سے دوسرا پہلے سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ نہ اس پر کوئی حاشیہ چڑھایا گیا ہے۔ نہ انسانی شہادت کی خامی سے اس کا رنگ بدلا ہے۔ اور نہ کسی شخص کے ذاتیات نے اس پر اثر ڈالا ہے۔ حالانکہ ہر فرد بشر کے آغاز اور بچپن کے حالات ان تمام باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان علموں کی شہادت کو غنیمت خیال کریں۔ اور دیکھیں کہ فرداً فرداً یہ علوم علم انسانی کے مختلف شعبے اپنے پیدا کرنے والے کی پیدائش اور بچپن کے متعلق کیا کہتے ہیں +

اگر ہم کسی منجم کے نقطۂ خیال سے نظام شمسی پر نظر کریں۔ تو ہم دیکھینگے کہ اس نظام کے مختلف رکن حیات کی حیثیت سے مختلف مدارج ترقی پر ہیں۔ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ تمام اجرام فلکی میں اس حالت کے قائم رکھنے کی قابلیت ہے۔ جسے ہم حیات یا زندگی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے سامنے ہی کی یہ تحقیق کہ فی الحقیقت تمام سیاروں اور ستاروں کے اجزا بالکل یکساں ہیں۔ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ تمام ستاروں اور سیاروں میں زندگی کے قائم رکھنے کی قابلیت بھی یکساں ہے۔ یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ کہ نظام شمسی کے متعلق تمام کُرے جن میں سے ایک یہ زمین ہے۔ سب کے سب بالکل یکساں اجزا سے بنے ہوئے ہیں۔ اور عظیم الشان آفتاب سے لے کر مریخ کے چاند تک ایک کرہ بھی ایسا نہیں جو اس یکسانیت سے الگ ہو۔ اس لئے یہ بات مان لینے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے گرد و نواح کے تمام کُرے قابل رہائش ہیں۔ مگر ایک اس سے بھی زیادہ قوی دلیل خود قیاس صحیح ہے۔ اُس آدمی کی عقل بھی طرفہ معجون ہوگی جو بے ردوکد یہ بات تسلیم کر سکتا ہے۔

کہ زندگی کا وجود صرف اس چھوٹے سے کرۂ زمین پر محدود ہے۔ ایسی ضعیف الاعتقادی بجز اس کے کہ ہر سمجھدار آدمی کے تبسم کا باعث ہو۔ اور کس لائق ہے؟ اس خیال سے بڑھکر بیہودہ اور پوچ کیا ہو سکتا ہے؟ کہ یہ نہایت ہی ناچیز اور بے وقعت کرہ۔ جس کا اجرام سماوی کے ہجوم میں ڈھونڈے بھی پتہ نہیں ملتا۔ قیام زندگی کے لئے منظور نظر اور مرغوب خاطر قطعہ قرار دیا جائے۔ اور باقی تمام کائنات کے کروڑہا کروڑ کرے جن میں سے ایک ایک اس سے ہزاروں گنا بڑا ہے۔ گویا محض بیکار پڑے رہیں۔ اور اتنا بے انتہا مادّہ بالکل فضول ضائع کیا جائے +

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ ۝

یہ سچ ہے کہ پرانے آدمیوں کا یہ خیال گو سراپا غلط اور مہمل مگر بالکل طبعی اور قدرتی تھا۔ اور وہ معذور بھی تھے۔ مگر آجکل کے ترقّی اور روشنی کے زمانے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر اس قدر لچر اور لایعنی خیال ایک منٹ کے لئے بھی کسی دماغ میں آسکتا ہے۔ اور کیونکر کوئی آدمی اتنا احمق اور کور خرد ہوسکتا ہے جو اس پر اعتبار کرے +

فی الجملہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان تمام کُروں کا وجود ان کی قابلیّت حیات پر دلالت کرتا ہے۔ کسی لحاظ سے بھی یہ ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ اشیائے مادی محض اپنے لئے پائی جاتی ہوں۔ اور قیاس صحیح کے نزدیک ہمارے جیسے کسی نظام کے وجود کا اور کیا مدّعا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اس میں آثار حیات پیدا کئے جائیں اور آخرکار اس میں عقل وتمیز والے جانداروں کا مسکن ہو۔ اگر کوئی چاہے اور بنا سکے تو ان ہزاروں نظاموں کی خلقت کی کوئی اور توجیہ بنا کر دکھائے۔ کوئی معقول اور مناسب توجیہ یا غیر معقول نہ سہی۔ مگر قرین قیاس تو ہو جو ان کے وجود کا کوئی اور سبب بتائے۔ معترض ذرا اس قسم کی کوشش کرکے دیکھے۔ اور اس کی ناکامی اس کی غلطی کو ثابت کردیگی۔ کائنات مادی کا حال ہی یہ ہے کہ وہ آثار حیات کے اظہار کے لئے مناسب سامان فراہم کرتی ہے۔ جس کی معراج کمال انسان

Marfat.com

جیسے ذی عقل جاندار کی پیدائش ہے +

ہم یہ مانتے ہیں کہ ہماری موجودہ حالت علمی میں ابھی تک کسی کُرے کی آبادی کا کوئی بیّن ثبوت نہیں ملا اور ممکن ہے کہ آئندہ سالہا سال تک یا خود حیات ارضی کے تمام ہونے تک بھی نہ ملے۔ لیکن ہماری تمام ترقیوں کا مدار اسی پر ہے کہ ہم قیاس صحیح پر غور کریں اور اس کے احکام پر اعتبار کریں۔ ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ تمام نظامات عبث اور بیکار ہیں۔ ہم یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ ہماری یہ چھوٹی سی زمین اور اسکی بھلائی بُرائی انتظام کائنات میں اپنے عظم وحجم کے اندازے سے بڑھ کر کوئی خاص رتبہ رکھتی ہے۔ اور ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ ہماری ذاتی بہبودی کیلئے قانون قدرت کوئی خاص رعایت یا کوئی انوکھی صورت اختیار کر سکتے ہیں +

اس طرح آخر ہم ان کُروں پر غور کرتے ہیں جن کا ہماری زمین سے ملکر ایک ہی نظام بنتا ہے جن کے ایک ہی سے حالات ہیں۔ جو ایک ہی سے قانون کے زیر اثر ہیں۔ جن میں ایک ہی سے تغیّرات ہوتے ہیں۔ اور جن کا ایک ہی سا انجام ہوتا ہے۔ وہ سیّارے جو فضائے کائنات میں دَور کرتے ہیں بالکل ہماری زمین ہی کی طرح ہیں۔ گو بعض چھوٹے اور بعض لاانتہا بڑے ہیں۔ مگر ساخت۔ خصوصیات اور مدعا ایک ہی ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ہمارے آس پاس کے سیّاروں اور زمین میں بڑا نمایاں فرق اُن کے موجودہ مدارج ترقّی میں پایا جاتا ہے۔ بعض اس تغیّر و تبدّل کی حالت میں ہیں۔ جو آثار حیات کے وقوع سے پہلے ہر ستارے پر گزرتے ہیں۔ اور جن میں سے ہماری زمین طبقات الارض کے زمانے میں مدتیں گزریں کہ گزر چکی ہے۔ بعض اور زیادہ تیز روی سے ان حالتوں کو حاصل کر چکے ہیں۔ جن کی طرف ہماری زمین آہستہ مگر یقینی طور پر جارہی ہے۔ اور جہاں پہنچنا اس کو قوانین قدرت کے مطابق ضروری اور لازمی ہے +

سیّاروں میں صرف عمر ہی کا اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی عمر اور عالم حیات کے باہمی تناسب میں بھی فرق ہوتا ہے کسی سیّارے کی محض قدامت

Marfat.com

سے اس کی قابلیت حیات کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی - یعنی بعض زیادہ قدیم ستاروں میں یہ تغیرات ایسے آہستہ ہوتے ہیں - کہ وہ بعض اور ستاروں سے جن میں یہ انقلاب نسبتاً جلدی ہوتے ہیں - قیام حیات کی قابلیت میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں - عام طور پر یہ بات بروے تحقیق کہی جاسکتی ہے کہ چھوٹے کرے کروی صورت حاصل کرنے کے بعد نسبتاً بہت جلد اپنے شباب پہنچ جاتے ہیں - اور بڑے بڑے کرے اس حالت تک بہت دیر میں اور بہت آہستہ آہستہ پہنچتے ہیں +

ہئیت جدید نے ہمارے نظام کے ہر ایک تارے کے درجۂ ترقی کا اندازہ لگایا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام میں تاروں کے لحاظ سے سب سے پرانے تارے مریخ (Jupiter) اور زحل (Saturn) ہیں - اور اسی لئے عالم حیات کے لحاظ سے یہ عظیم الشان دنیائیں سب سے چھوٹی اور بچپن کی حالت میں ہیں اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ یا جوان تارے ہماری زمین اور عطارد (Mars) ہیں - جو اور بھی بہت سی کیفیتوں میں متفق ہیں - گو اس میں شک نہیں کہ خود ان دونوں تاروں میں زمین زیادہ سن رسیدہ ہے - کیونکہ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ تاروں کی عمر ان کی کیفیت حیات سے قرار دی جاتی ہے - ہمارا مطلب یہ ہے کہ زمین اور عطارد نے اپنی بے انتہا حرارت کا زائد حصہ جلد دور کر دیا - اور ان کی سطح اور تمام تاروں کی نسبت بہت جلدی ٹھنڈی ہو کر نباتات اور حیوانات کی رہائش کے قابل ہو گئی - حالانکہ سب سے بڑے اور سب سے پرانے تارے مریخ اور زحل ابھی اس حالت سے بہت دور ہیں - گو اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس حالت پر پہنچینگے ضرور اور کبھی نہ کبھی اُن کی زمین اور اُن کے سمندر نباتات اور حیوانات سے آباد ہونگے - اس میں بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ رفتہ رفتہ ہماری زمین اور عطارد کی یہ قیام حیات کی قابلیت زائل ہو جائیگی - اور اس کے بعد ہماری زمین پر کسی قسم کے جاندار کا وجود بھی ممکن نہ ہوگا - اور گو یہ ممکن ہے کہ خود یہ کرہ بے انتہا عرصے تک نظام شمسی میں اپنی جگہ قائم رہے - مگر ہماری شاعرانہ اصطلاح میں وہ وقت زمین کی موت کا ہوگا +

غرض مذکورۂ بالا تمام بیان سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہر ستارے کی عمر میں ایک وقت ایسا آتا ہے۔ کہ اس میں قیام حیات کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت سے عالم حیات شروع ہو کر اس ستارے کی حالتوں کے برابر برابر قائم رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر اس کی حالتیں اتنی بدل جاتی ہیں کہ وہ فعل زندگی کو روک کر عالم حیات کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ اور اس کے بعد وہ ستارہ گویا مر جاتا ہے۔ (جیسے غالباً ہمارا چاند ہے) اگرچہ اس سے اس کی حرکتوں اور اس کی جگہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اب اس تمہید کے بعد ہم کو مختصراً یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہماری زمین نے علم ہیئت کی حیثیت سے ہمارے استقبال کی کیا تیاری کی تھی۔ اور کس کس انقلاب کے بعد یہ زمین ہماری رہائش کے قابل ہوئی۔ کیونکہ ہم کو اس کا یقین کر لینا چاہیئے کہ زمین کی یہ قابلیت اور انسان کی پیدائش قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی ہوگی۔ زمین کی آبادی میں سب سے زیادہ موثر کیفیت حرارت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علم ہیئت کے قاعدوں کے مطابق ایک مساوات حرارت بنا لیں۔ زمین کی وجود انسانی سے پہلے کی ہیئتی حالت جان لیں۔ اور زمین کی کیفیت نجمی کے انقلاب کی رفتار کا اندازہ کر لیں تو ہم نسل انسانی کے آغاز کا وقت تخمیناً صحیح بتا سکینگے۔ مذکورہ مساوات حرارت کا بڑا انحصار اس تھرتھراہٹ یا کمی بیشی پر ہے جو زمین کے ہیولٰے اوّل سے الگ ہونے سے لے کر اُس کی انتہا تک اُس کے آربٹ[1] (مدار یا طریق الارض) میں رہی ہے اور رہیگی۔ یہاں ہم کو علم ہیئت کے چند مسائل کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جن کو گو جاننے تو عموماً سب ہیں۔ مگر جن کی پوری اہمیت کا اندازہ ٹھیک نہیں کیا گیا۔ زمین کا آربٹ بیضوی ہے۔ جس کا ایک فوکس[2] یا مرکز سورج ہے۔ لیکن اس بیضے کی صورت ہمیشہ

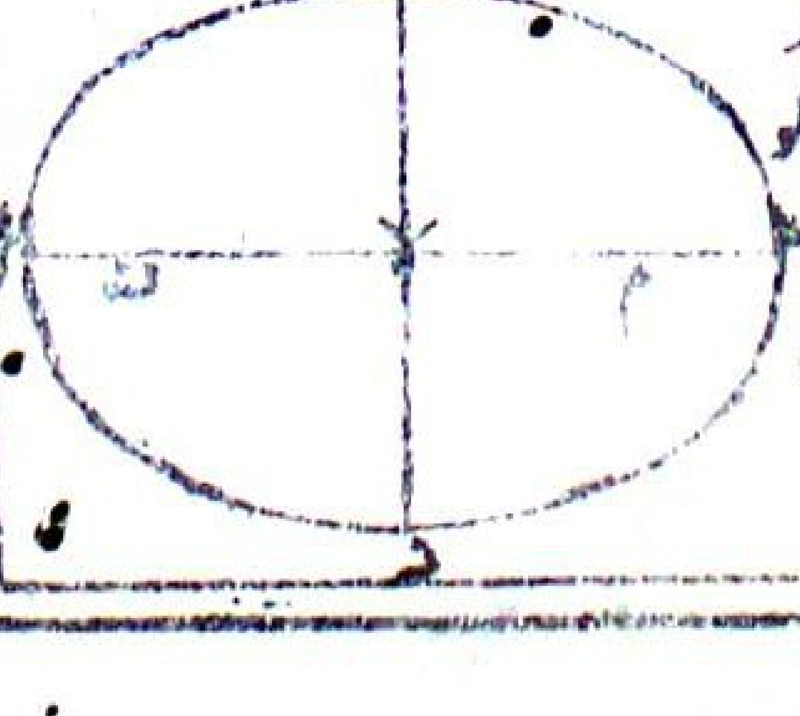

[1] (مدار یا طریق الارض) اس شکل کو کہتے ہیں جو زمین اپنی حرکت حولیہ میں آفتاب کے گرد گردش کرتے ہوئے فضائے محیط میں بناتی ہے۔ [2] علم ریاضی کے اُس شعبے میں جسکو انگریزی میں کونک سکشن یعنی "تقطیع مخروطیات" کہتے ہیں۔ بیضوی شکل یا ایلپس کی یہ تعریف ہے۔ کہ وہ ایسی شکل ہے جسکا محیط ایک محدود خط منحنی ہو۔ اور اس میں دو نقطے (ف۔م) ایسے ہوں کہ اس خط منحنی کے ہر ایک نقطے۔ اور ان دونوں نقطوں

یکساں نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے دونوں قطر جو باہم زاویہ قائمہ بناتے ہیں۔ ہمیشہ یکساں طویل نہیں ہوتے۔ بلکہ ان میں ایک تغیّر جاری رہتا ہے۔ جس سے ان دونوں کے طول کی نسبت بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے زمین کے بیضوی آربٹ کی صورت بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ پہلے اس کا چھوٹا قطر بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک یہ بڑے قطر کے قریب قریب لمبا ہو جاتا ہے۔ گو برابر کبھی نہیں ہوتا۔ اور بیضوی آربٹ تقریباً مدور بن جاتا ہے۔ گو پورا دائرہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یہ پھر سکڑنے لگتا ہے۔ اور بڑے قطر سے بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ جس صورت میں آربٹ انتہا درجے کی لمبائی حاصل کر لیتا ہے۔ اور دائرے سے نہایت دور جا پڑتا ہے۔ اس انتہا لمبائی کو آربٹ کی اکسنٹریسٹی کہتے ہیں۔ اس کے بعد پھر چھوٹا قطر بڑھنے لگتا ہے۔ اور یہ سلسلہ یونہی خدا جانے کب سے جاری ہے۔ اور کب تک جاری رہیگا +

اس میں شک نہیں کہ یہ تغیّر بہت دیر دیر میں واقع ہوتا ہے۔ نقاط معدل النہار کی حرکت اقدامی کے زور سے دونوں قطروں کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اور وہ دونوں وقتاً فوقتاً آسمان کے مختلف حصّوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور حدود مقررہ کے اندر سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ یہ باتیں ہیں۔ جن پر زمین کے آربٹ کی یکسانی منحصر ہے +

یہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ناظرین ظاہری طریق الشمس کی سطح ہمارے کرّے کے آربٹ کی صورت اور آفتاب کی ظاہری حرکت کی سطح۔ زمین کے محور اور اس سطح کا درمیانی زاویہ۔ خطوطِ استوائے ارضی و فلکی۔ اور نقاط تقارب و تباعد سے

(بقیہ صفحہ ۲۳) کے درمیانی فاصلے کا مجموعہ ہمیشہ یکساں رہے۔ ان دونوں نقطوں میں سے ہر ایک کو فوکس یا نقطہ ماسک کہتے ہیں جو خط (ا ب) دونوں فوکسوں میں سے ہوتا ہوا محیط اہلیس کو کاٹتا ہے۔ وہ قطر بزرگ کہلاتا ہے۔ اور جو خط (ج د) اس قطر بزرگ کے نقطۂ اوسط (ہ) سے اس پر عمود وار گزرتا ہے وہ قطر خرد کہلاتا ہے +
یہ ظاہر ہے۔ کہ جس قدر ان دونوں قطروں کے طول میں فرق کم ہوگا۔ اُسی قدر اس بیضے کی شکل زیادہ مدور ہوتی جائیگی۔ اور اگر یہ دونوں برابر ہو جائیں تو بیضہ پورا دائرہ بنجائے۔ اور دونوں فوکس باہم قریب ہوتے ہوتے آخر دونوں قطروں کے نقطۂ تقاطع پر ملجائیں۔ اور اس دائرے کا مرکز بنجائیں۔ اس کے برعکس ان دونوں قطروں میں جس قدر فرق زیادہ ہوگا اُسی قدر بیضے کی شکل دائرے سے زیادہ متفاوت ہوتی جائیگی۔ اور اگر یہ فرق بے حد بڑھ جائیگا۔ تو ایک وقت آجائیگا کہ قطر خرد صرف ایک نقطہ

خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ بھی مان لیا گیا ہے کہ وہ خزاں اور بہار کے نقاط معتدل النہار اور ان کی حرکت اقدامی کو سمجھتے ہیں۔ موسموں کے اختلاف کے اسباب جانتے ہیں۔ اور غالباً یہ سمجھنے کے قابل ہیں۔ کہ یہ تمام گوناں گونی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ زمین کا محور اس کے آربٹ کی سطح سے ایک خاص زاویہ بناتا ہے۔ اور اس کا آربٹ کبھی دائرے کے قریب کی اور کبھی دور کی صورت اختیار کرتا ہے۔ بہرحال یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہماری زمین کا آربٹ دائرے کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ بڑا قطر چھوٹا ہو رہا ہے۔ اور چھوٹا بڑھ رہا ہے۔ اور آربٹ کی اکسنٹریسٹی نہایت آہستہ مگر یقینی طور پر گھٹتی جاتی ہے۔ اور تقارب اور تباعد کی مسافتوں کا فرق کم ہو رہا ہے۔ اور برابر کم ہوتا جائیگا۔ یہانتک کہ اپنی انتہائی حد تک پہنچ جائے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی شرائط بدل جائینگی۔ اور فوراً ترقی معکوس شروع ہو جائیگی۔ بڑا قطر بڑھنے لگیگا۔ اور چھوٹا قطر گھٹنے لگیگا۔ اور یہ تغیر نقاط تقارب و تباعد کی صورت کو بھی بدل دیگا۔ علمائے حال نے ان تغیرات پر بڑا غور کیا ہے۔ اور چند دن سے ہی ان کے وقت کا بھی اندازہ کرنے کی جرأت کی ہے۔ اب ہمارے آربٹ کی مساوات کے رکن زیادہ وضاحت سے معلوم ہو گئے ہیں۔ اور ان کے حل کرنے سے معلوم ہؤا ہے کہ ہمارے آربٹ کی زیادہ سے زیادہ اکسنٹریسٹی ۰.۰۷۴۷ ہے اور کم سے کم ۰.۰۰۱۰۲ ہے۔ ان دونوں حدوں کے درمیان ہمارا آربٹ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور نئے نئے موسم آتے رہتے ہیں +

ہم یہاں مساوات حرارت کے بھی ضروری اجزا کا مختصر حال بیان کر دیں تو مناسب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے آربٹ میں ایک نقطہ تقارب[1] ہے۔ اور ایک نقطہ تباعد[2]۔ فی الحال ان دونوں خاص صورتوں میں زمین اور آفتاب

(بقیہ صفحہ ۲۴) رہ جائیگا۔ اور بیضہ اپنے قطر بزرگ پر منطبق ہو کر ایک سطح ہونے کی بجائے صرف ایک خط بنجائیگا +

[1] نقطۂ تقارب یعنی مدار الارض کا وہ مقام جہاں زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا ہے۔ جو شکل مذکور میں نقطہ ا پر واقع ہؤا ہے +

[2] نقطۂ تباعد۔ یعنی مدار الارض کا وہ مقام جہاں زمین اور سورج کا باہمی فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے جو شکل مذکور میں نقطۂ ب دکھایا گیا ہے +

Marfat.com

کی مسافتوں کا فرق تیس لاکھ میل ہے۔ ہر شخص جان سکتا ہے کہ یہ فرق گرمی پیدا کرنے میں کتنا نمایاں اختلاف ڈال سکتا ہے۔ یہ بات غور سے مدنظر رکھنی چاہئے کہ آج کل ہمارا نقطۂ تقارب عین سرما میں اور نقطۂ تباعد وسط گرما میں واقع ہوتا ہے۔ صاف عبارت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب محور زمین کے میلان کی وجہ سے دن نہایت چھوٹے اور راتیں نہایت بڑی ہوتی ہیں۔ اور سردی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو ہم سورج سے تیس لاکھ میل زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ بہ نسبت اُس زمانے کے جب کہ گرمی کا زور ہوتا ہے۔ اور آفتاب عین ہمارے سروں پہ چمکتا ہوتا ہے۔ خود آفتاب کی گرمی دو صاف شرطوں پر مبنی ہے۔ شرط اوّل وہ زاویہ ہے جو آفتابی شعاعیں زمین کے ساتھ بناتی ہیں۔ شرط دوم وہ فاصلہ ہے جو زمین اور آفتاب میں واقع ہوتا ہے۔ اگر ہم عرف خاص کی بجائے عرف عام میں یہ مطلب ادا کریں تو بات صرف یہ ہے کہ اگر سورج کی کرنیں سیدھی پڑیں تو گرمی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اگر ترچھی ہوں۔ تو گرمی بھی اسی قدر کم ہو۔ دوسرے یہ کہ زمین جتنی سورج کے پاس آجائے اتنی ہی گرمی شدید ہو۔ اور جتنی دور چلی جائے اُسی قدر گرمی کم ہو۔ کیونکہ گرمی کی کمی اور دونوں کُروں کے بُعد کے مربّع باہم متناسب ہوتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ جو خوش قسمتی سے شمالی حصے میں بستے ہیں عین سردی میں آفتاب کے قریب اور ٹھیک گرمی میں آفتاب سے دور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ایک طرف سردی کی شدّت کم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف گرمی کی حدّت گھٹ جاتی ہے۔ اگر معاملہ برعکس ہوتا۔ یعنی نقطہ تقارب گرمی میں اور نقطہ تباعد سردی میں آتا تو آسانی سے قیاس ہو سکتا ہے۔ کہ موسموں میں کیا فرق ہوتا۔ بجائے اس کے کہ آج کل کی طرح دونوں موسموں میں اعتدال ہوتا۔ ایک طرف سردی کی سختی آفتاب سے دوری کی وجہ سے اور بڑھ جاتی۔ دوسری طرف گرمی کی تیزی آفتاب کی نزدیکی کے سبب سے اور زیادہ ہو جاتی +

فاضل لوگوں نے موسموں کی اس تبدیلی کا اندازہ کیا ہے۔ اور یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ اگر مذکورۂ بالا نا موافق صورت ہوتی تو جاڑوں میں سردی اور گرمیوں

Marfat.com

میں گرمی تقریباً ۱/۱۵ پندرھواں حصہ موجودہ حالت سے زیادہ ہوتی۔ گویا اب موجودہ حالت میں حصہ شمالی میں ۲/۱۵ حصے گرمی اور سردی معتدل ہو جاتی ہے +

کہا جاتا ہے کہ بہت دن ہوئے ایک زمانہ فی الواقع ایسا ہی تھا کہ نقطہ تقارب گرمی میں اور نقطہ تباعد سردی میں آیا کرتا تھا۔ ایک بات یہ بھی دل نشین رکھنی چاہیئے کہ آج کل آربٹ کی اکسنٹریسی انتہائی طوالت کی حالت سے بہت کم ہے۔ اس نہایت ہی دور دراز کے گزشتہ زمانے میں مسافت تقارب یعنی زمین کی سورج سے کم سے کم دوری آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل تھی۔ اور مسافت تباعد یعنی زیادہ سے زیادہ بُعد ۹ کروڑ نوّے لاکھ میل۔ اس طرح ان دونوں مسافتوں کا فرق ایک کروڑ چالیس لاکھ میل تھا۔ حالانکہ آج کل یہ فرق صرف تیس لاکھ میل ہے۔ اور جب یہ تفاوت موسموں کی حرارت میں ۲/۱۵ کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ تو اس زمانے میں گرمی کی حدّت اور سردی کی شدّت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے +

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم یہ تمام باتیں شمالی حصۂ زمین کے لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔ جس زمانے میں آربٹ انتہائی طوالت کی حالت میں تھا۔ اس وقت چونکہ نقطہ تباعد سردی میں آتا تھا۔ اس لئے حصہ شمالی میں آج کل کی نسبت نہایت سخت اور شدید سردی پڑتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارا کرہ قیام حیات کے بالکل قابل نہ تھا۔ اور وہ حالت آج کل کی حالت کے بالکل برعکس تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حصۂ شمالی کی وہ سردی جو اب بھی اس قدر سخت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے بڑے قطعوں کو برف پوش بنا دیتی ہے۔ اور اکثر زیادہ شمالی زمینوں کو ہمیشہ برف میں دبائے رکھتی ہے۔ اس کی اُس وقت کیا حالت ہو گی۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ گرمی بھی تو اسی نسبت سے سخت اور تیز ہوتی ہو گی۔ مگر اس کا جواب یہ ہے۔ کہ گرمی سخت تو واقعی زیادہ ہوتی تھی۔ مگر رہتی بہت کم تھی۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سیّاروں کی رفتار نقطۂ تقارب کے آس پاس نہایت تیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس حالت میں جو موسم بھی ہوتا ہے وہ جلد ختم ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے نقطۂ تباعد کے قریب رفتار

Marfat.com

انتہا درجے کی سست پڑ جاتی ہے۔ اس لئے اس حالت میں جو موسم ہوتا ہے وہ بہت زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ پس چونکہ اس زمانے میں نقطہ تقارب کی حالت میں گرمی ہوتی تھی۔ اس لئے گو سخت ہوتی تھی۔ مگر رہتی بہت کم تھی۔ البتہ جنوبی حصے میں یہ حال نہ تھا۔ کیونکہ وہاں شمالی حصے کے برعکس موسم رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں کی سردی گرمی کی شدت اور درازی کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے وہاں کے برف کے پہاڑ پگھل پگھل کر سمندر بن گئے ہونگے۔

اس بیان کے بعد ہم یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ آج کل کے موسموں کو دیکھکر ہم اس زمانۂ قدیم (جس کا اوپر ذکر ہؤا) کے موسموں کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر نوع انسان کا مسکن شمالی حصہ ہے۔ اس کے موسم آثار زندگی کی قابلیت کے لئے معتدل ہو گئے ہیں۔ لیکن جنوبی حصے میں حال برعکس ہے۔ وہاں قطب جنوبی سے سینکڑوں ہزاروں میل تک دائمی برف کے پہاڑ اور برف کے سمندر پھیلے ہوئے ہیں۔ بحر منجمد جنوبی میں زمین کی نایابی ہی زندگی کی مانع نہیں ہے۔ بلکہ دائمی سردی کی سختی بھی ہر ایک صورت حیات کو روکتی ہے۔ وہ موافق حرارت کے ۲/۱۵ حصے وہاں مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم ہیئت کے لحاظ سے آج کل رہائش کے لئے شمالی حصہ جنوبی حصہ کی نسبت ۲/۱۵ حصے زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ یہ حالت ذہن نشین کر کے اب ناظرین کو چاہیئے کہ ہمارے ساتھ اس زمانے کا تصور کریں۔ جب آربٹ کی انتہائی لمبائی کی حالت میں سردی نقطہ تباعد کے ساتھ آتی تھی۔ جب کہ برف کے پہاڑ قطب شمالی اور بحر منجمد سے لے کر خط استوا کے آس پاس تک تمام سطح زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی جنوبی حصے کی زمین صاف اور ہوا معتدل تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں منطقۂ باردۂ جنوبی کے کچھ حصے سطح سمندر سے اوپر ہوں۔ اور حصہ شمالی کے اکثر جزیرے اور ملک برف میں دبے ہوئے ہوں۔ حاصل کلام یہ کہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم علم ہیئت کے لحاظ سے علم طبقات الارض کے اس زمانے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ جس کو اس علم والے یخ بستہ عالم کہتے ہیں۔ ہم نے اس کی وجہ بھی دیکھ لی ہے۔ ہم نے یہ بھی جان لیا

Marfat.com

ہے کہ آربٹ کی انتہائی طوالت کی حالت نقاط تقارب وتباعد کی گرمی اور سردی میں آنے سے زمین کا شمالی حصہ بالکل برف میں چھپا ہؤا تھا +

بہرحال ہم نے علم ہیئت سے جیالوجی کے عالم یخ بستہ کا وجود ثابت کر دیا ہے۔ اور ہم نے اس کی وجہ بھی دیکھ لی ہے۔ ہم ان اسباب کو بھی پوری صفائی سے دیکھ سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس زمانۂ ویرانی کو یقینی ظہور انسان سے پہلے ختم کر دیا۔ ان اسباب کی بڑی وجہ بھی وہی آربٹ کی صورتوں کی تبدیلی تھی۔ اگرچہ قیاساً اس برفانی زمانے کا کمال نقطہ تباعد کے سردی میں آنے اور آربٹ کی لمبائی کے کمال کے ساتھ تھا۔ مگر جس طرح آج کل سردی کا زور بجائے ۲۲۔ دسمبر کے عموماً وسط جنوری تک رہتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ قدیم میں بھی عملاً برفانی زمانہ آربٹ کی انتہائی لمبائی کے ایک عرصے بعد تک رہا ہوگا۔ اور اس کے بعد سردی کا زور کم ہونا شروع ہو گیا ہوگا۔ انتہائی لمبائی کے بعد قطر بزرگ کا گھٹنا اور قطر خورد کا بڑھنا یقینی اور لازمی ہے۔ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ نقطہ تباعد نے بھی وسط سرما سے ہٹنا شروع کیا۔ ہر سال آفتاب زیادہ موافق اور مناسب جگہ میں آتا گیا۔ یعنی بقول **سعدی**

تا ربایدکلہ قاقم برف از سر کوہ
یزک تابش خورشید بغا برخاست

نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ عالمگیر برف کی چادر کے نیچے کے کونے شمالی دنیا سے آہستہ آہستہ ہٹنے لگے۔ کبھی کبھی برف کے پہاڑ کے پہاڑ نیچے آپڑتے ہونگے۔ جیسے اب بھی کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت چھوٹے پیمانے پر۔ اس طرح رفتہ رفتہ شمالی دنیا کے منطقۂ حارّہ اور معتدلہ کے مختلف حصّوں کا برف گھل گھل کر عظیم الشان دریاؤں کی صورت میں بہتا ہوگا +

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملکوں نے موجودہ صورت کب اور کس طرح اختیار کی۔ یہی زمانہ تھا۔ کہ آہستہ آہستہ امتداد وقت سے برف پگھل جانے کے بعد وہ عظیم الشان وادیاں بن گئیں جن کی تہ میں اب تک ان خوفناک برفانی دریاؤں کی مٹی مٹی نشانیاں۔ یعنی آج کل کی ندیاں بہتی ہیں۔ شمالی حصّے کے تمام

براعظموں اور ملکوں میں یہ بات بالخصوص قابل دید ہے۔ کہ دریائی گھاٹیاں اتنی وسیع ہیں۔ کہ تاریخی زمانے میں جو دریا اس میں بہتے رہے ہیں۔ اُن کو گھاٹیوں کی وسعت سے کچھ نسبت ہی نہیں ۔ مزید برآں ان گھاٹیوں کا امتحان کرنے سے یہ بات قطعاً ثابت ہوجاتی ہے۔ کہ کسی زمانے میں یہ نہایت عظیم الشان اور تیزی سے بہتے ہوئے دریاؤں سے پُر تھیں ۔ جو ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چڑھے ہوئے تھے ۔ اور کئی کئی میل چوڑے ہوتے تھے۔ یہ دریا اپنے بے انتہا سیلابوں کے بہاؤ میں پرانے یخ بستہ عالم کی ہر ہلکی بھاری چیز اور اپنے کوہ آسا تودہائے برف کے دباؤ سے پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑے اپنے ساتھ بہائے لئے جاتے تھے ۔ یہ مضمون حقیقت میں علم طبقات الارض کا ایک جزو ہے ۔ مگر ناظرین نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ان دونوں علموں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اور ایک کا انجام دوسرے کا آغاز ہے ۔ یہاں ہم جس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ظہور انسانی عالم یخ سے اِس طرف واقع ہؤا ہے۔ کیونکہ مذکورۂ بالا واقعات صاف بتا رہے ہیں۔ کہ وہ زمانہ جبکہ یہ عظیم الشان برفانی دریا اتر گئے۔ جو شمالی دنیا میں یخ کے پہاڑوں کے پگھلنے سے چڑھ گئے تھے ۔ وہ وقت تھا۔ جس میں حیات انسانی کے ظہور کی ابتدا ہوئی +

یہاں یہ ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ہم ان تمام دلیلوں کو پیش کریں۔ جن کو دیکھ کر ظہور انسانی کے لئے یہ وقت قرار دیا ہے ۔ ان کا تعلق علم طبقات الارض کی بحث قدامت انسان سے ہے ۔ یہاں ہم صرف یہ چاہتے ہیں۔ کہ اگر ہو سکے تو ان مذکورہ انقلابات کو کبھی کی میعاد اور ان کے وقت کا اندازہ کریں ۔ اور پھر ان سے ظہور انسانی کی تاریخ کا تخمینہ لگائیں ۔ اس قسم کی تحقیقات میں یقینی نتیجے چاہنا تو محض ناممکن اور خلاف عقل ہے۔ علم ہیئت کے زمانوں اور طبقات الارض کی مدتوں کو شمار کرنے میں یہ چھوٹی چھوٹی سی صدیاں اور قرنیں جو آدمیوں نے دلوں اور موسموں کے اختلاف سے اپنے لئے بنا رکھی ہیں۔ نظر سے غائب ہوجاتی ہیں۔ ان بڑی بڑی باتوں کے لئے معیار بھی بڑے بڑے

Marfat.com

ہی ہونے چاہئیں۔ اگر ہم انقلابات سماوی کے لئے ہزاروں لاکھوں کو ایک ایک اکائی فرض نہ کریں۔ تو سالوں اور صدیوں کو گنتے گنتے ہمارے اعداد تمام ہو جائیں۔ اور جہاں اکائیاں ایسی ہوں وہاں کسی واقعے کا ٹھیک سال اور مہینہ بتلانے کا کون خیال کرسکتا ہے ✦

خوش قسمتی سے آج کل علم طبعیات اتنی ترقّی کرچکا ہے۔ کہ ہم اس تخمینے کو قریب قریب بالکل صحت تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہرشل کے زمانے سے طریق الارض کی تبدیلیاں اور اس کے نتیجے یعنی موسموں کے اختلاف پر پورا غور و خوض ہوتا رہا ہے۔ ہرشل کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا میں اراگو۔ ہمبولٹ اور اور مشہور علما نے اس پر بحث کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر جیمس کرول اپنی تحقیقات میں اپنے تمام متقدمین سے زیادہ کامیاب ہؤا۔ اس نے سن گیارہ لاکھ قبل مسیح سے اب تک کا ایک نقشہ تیار کیا ہے۔ اس زمانے کو اس نے دس دس ہزار برس کے ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر ٹکڑے کے لئے طریق الارض کی مسافت تقارب و تباعد کا فرق اور گرمی کے دنوں سے سردی کے دنوں کی زیادتی دریافت کی ہے ✦

علمائے ہیئت داں خوب واقف ہیں۔ کہ بعض خاص معلومہ وجوہات سے اکسنٹریسٹی کی کمی بیشی پوری باقاعدہ نہیں ہے۔ مگر ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عام طور پر تمام غالوں میں کمی بیشی ایک خاص طور پر اور خاص مناسبت سے ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام غالوں کے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے اعداد میں ایک نمایاں مگر بظاہر غیر مقررہ تعلق پایا جاتا ہے۔ اس نقشے سے وہ زمانے آسانی سے دریافت ہو سکتے ہیں۔ جبکہ طریق الارض انتہائی طوالت کی حالت میں تھا۔ ان میں سے پہلا واقعہ ۹ لاکھ پچاس ہزار سال قبل مسیح۔ دوسرا۔ ۸ لاکھ پچاس ہزار سال پہلے۔ تیسرا۔ ۷ لاکھ پچانوے ہزار سال پہلے۔ چوتھا اس حد سے ذرا آگے بڑھ کر ۶ لاکھ سال پہلے۔ پانچواں ۵ لاکھ سال پہلے۔ چھٹا ۲ لاکھ پچاس ہزار اور ۳ لاکھ کے درمیان میں۔ اس کے بعد ۲ لاکھ دس ہزار سال پہلے۔ اور آخری ایک لاکھ سال پہلے ہؤا۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں

Marfat.com

کہ گزشتہ ۱۰ لاکھ سال میں طریق الارض کے ایک دفعہ انتہائی طول حاصل کرنے سے لے کر دوبارہ اس حالت میں آنے کے لئے کم و بیش ایک لاکھ سال چاہئیں۔ یہ حرکت اس قدر باترتیب ہے کہ ہم اس عرصے کو اندازاً تبدیلی کا ایک معیار قرار دے سکتے ہیں۔ ابتدائی تمام صورتوں کو نظر انداز کر کے ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ انتہائی طول کی آخری حالت لاکھ سال قبل مسیح واقع ہوئی۔ موجودہ تحقیقات کے لئے ہم اسے اپنی خاص تاریخ مقرر کر سکتے ہیں۔ یہ زمانہ انتہائی طول کا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں نقطۂ تباعد بھی سردی میں آتا تھا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ یہ وقت ہمارے کُرے کی آخری انتہائی سردی کا زمانہ تھا۔ یا طبقات الارض کی اصطلاح کے مطابق یوں کہیئے کہ یہ یخ بستگی کا عالم تھا۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ شدید سرما کی حالت ننننہ قبل مسیح سے کچھ ورے تک قائم رہی ہوگی۔ اور جس طرح معمولی طور پر سالانہ سردی کی شدت ۲۲- دسمبر کی بجائے وسط جنوری تک خیال کی جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہم کو اندازاً ۵ یا ۱۰ ہزار برس اور سردی کی شدت کے نذر کر دینے چاہئیں۔ اس کے بعد قطعی ان اسباب میں تغیّر شروع ہو گیا ہوگا۔ جو عالم یخ کے ظہور کا موجب تھے۔ یعنی ہر سال سورج اور زمین زیادہ مناسب اور موافق موقعوں پر آتے گئے۔ اور آخر کار قانون قدرت کے اثروں سے کوہ نما تودہائے برف کے جنوبی کنارے پگھلنے لگے۔ اور دریاؤں کی اُسی طغیانی اور سیلاب کا عالم پیدا ہو گیا۔ جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ مگر اب ہمارے پاس وقت کا معیار بھی ہے۔ جو پہلے ذکر میں نہ تھا۔ اور یہ وقت کا معیار علم ہیئت کی تحقیقات کے مطابق مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی اب ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ انتہائے سرما کا عالم لاکھ سال قبل مسیح اپنے زوروں پر تھا۔ اور اس کے بعد ایک مدت مدید تک رہا۔ یہاں تک کہ تغیّر حالات سے حرارت بڑھی اور اس کا زور کم ہونے لگا۔ یہ معلوم کرنا کہ وہ مدت مدید کس قدر تھی۔ جس کے بعد حرارت آفتاب برفستان کے جنوبی حصّوں کو پگھلانے کے قابل ہوئی صرف قیاس اور اندازے کا کام ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ مدت بہت معقول تھی۔

اس میں تو کچھ شک ہی نہیں ہو سکتا کہ ظہور انسانی عالم یخ کے بعد ہوا۔ کیونکہ اس زمانے کی شمالی حصۂ زمین کی معلومہ اور مذکورہ حالتوں کی وجہ سے وجود انسانی اگر عالم یخ سے پہلے ہوتا بھی تو معدوم ہو جاتا۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ" وہ جاندار جو انسان کہلاتا ہے عالم یخ کے بعد اُس وقت اس زمین پر آیا۔ جبکہ اس کی سطح تودہائے برف سے صاف ہو کر قابل رہائش ہو گئی تھی۔ جبکہ برفانی دریا اپنی طغیانی کے بعد پھر اتر چکے تھے۔ اور برّاعظموں کی موجودہ صورت اور تقسیم قائم ہو چکی تھی"+

پیشتر اس کے کہ ہم اس علم کی تحقیقات کو چھوڑ کر علم طبقات الارض کی طرف جھکیں۔ بہتر ہے کہ جانے سے پہلے ایک دو نتیجے اور بھی ذہن نشین کریں۔ جو اسی علم کے قواعد کے مطابق نکل آتے ہیں +

ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذکورۂ بالا آخری بار کی انتہائی طوالت سے پہلے کا زمانہ ایسی حالتوں میں آیا تھا جو شمالی حصے میں گرمی کے لئے مناسب تھیں۔ یعنی اب سے قریباً ۲ لاکھ ۱۰ ہزار برس پہلے نقطۂ تقارب سردی میں آتا تھا۔ جس کا نتیجہ گرمی کی زیادتی اور اس کے متعلق تمام موسموں کی تبدیلی تھا۔ اس قیاس کی تائید علم طبقات الارض سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس علم کے مطابق یہ بات مسلّم اور محقّق ہے کہ عالم یخ سے پہلے گرمی کی شدت کا زمانہ تھا۔ اور اس برف کے ڈھیر اور یخ کے پہاڑ جمع ہو جانے سے پہلے منطقۂ معتدلہ بلکہ منطقۂ باردہ تک میں منطقۂ حارہ کی سی حالت پائی جاتی تھی +

اس گرمی کے بیان کے متعلق ایک نہایت ضروری اور اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے کی نباتات اور حیوانات کے کچھ بقیے جو گویا عالم یخ میں دفن ہو کر عالم طغیانی (طوفان) میں پھر ظاہر ہوئے۔ زمانہ مابعد کے حیوانات اور نباتات کے بقیوں سے ایسے مل جُل گئے ہیں۔ کہ بے پروا طالب علم اور عام دیکھنے والا دونوں کو ہم عصر ہی خیال کرتا ہے۔ اگرچہ محقق بالغ نظر کے لئے دشواری نہیں ہوتی۔ اس بات سے بڑا نتیجہ یہ نکلتا

Marfat.com

ہے کہ آثار حیات کے ظہور کا میدان کتنا وسیع ہے۔ اور جب عالم یخ اور اس سے پہلے کے شدت گرما کے زمانے میں کم و بیش ایک لاکھ برس کا بُعد تھا۔ تو ہم کو قوانین قدرت کی آہستگی اور یکسانیت دیکھتے ہوئے یہ مان لینا چاہئے کہ اس عالم یخ اور آج کل کے زمانے میں بھی اس سے کم مدت نہ ہوگی +

شاید یہاں اس تمام بحث کا ایک مختصر اور مجمل خلاصہ کر دینے سے وہ تمام اسباب اور نتائج جن سے قدامت انسان کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ناظرین کے زیادہ ذہن نشین ہو جائیں۔ اس لئے ہم نہایت مختصر الفاظ میں اپنی بحث کو پھر دُہراتے ہیں :۔

(۱) آخری دفعہ طریق الارض کی انتہائی طوالت ایک لاکھ سال قبل مسیح واقع ہوئی +

(۲) اس زمانے میں نقطۂ تباعد سردی میں آتا تھا +

(۳) ان دونوں مجموعی وجہوں سے کرۂ زمین کے شمالی حصّے میں نہایت سخت سردی پیدا ہو گئی تھی۔ جو اصطلاح علم طبقات الارض میں عالم یخ کے نام سے مشہور ہے +

(۴) یہ سردی کی شدّت مذکورۂ بالا (۱) اور (۲) فقروں کی حالت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصے تک رہی +

(۵) اس شدت سرما کے گھٹ جانے کے بعد کرۂ شمالی کے موسم سال بسال معتدل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ آخر وہ نوع انسانی کے وجود اور بقا کے مناسب ہو گئے +

(۶) یہ مناسب اعتدال اس وقت ہوا۔ جب کہ بڑے بڑے برفانی دریاؤں کی طغیانی کم ہو گئی۔ جو یخ کے پہاڑوں کے پگھلنے سے پیدا ہوئی تھی +

(۷) اندازاً اس عرصۂ طویل کا ایک چوتھائی یعنی ۲۵ ہزار برس شدت سرما کی کمی اور برفانی دریاؤں کے اترنے کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں +

(۸) اس کے بعد گویا ہم کو یہ معلوم ہو جائیگا۔ کہ کرۂ شمالی کے قابل رہائش ہونے کی زیادہ سے زیادہ مدت ۷۵ ہزار سال ہے۔ جبکہ اس پر ظہور وجود

انسانی کا امکان تھا۔ لیکن

(۹) یہ معرصہ انتہائی حد بتلاتا ہے۔ جس کے پرے کسی علم اور کسی محقق کو وجود انسانی کی امید یا جستجو نہ کرنی چاہیئے +

(۱۰) عموماً جہاں دو ابتدائی اور انتہائی مدتیں معلوم ہوں۔ وہاں سب سے زیادہ مناسب اور قرین قیاس ان دونوں مدتوں کی اوسط ہوتی ہے +

(۱۱) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم ہیئت کی تحقیقات کے لحاظ سے طریق الارض کے تغیر و تبدل دیکھتے ہوئے آفرینش انسان کی ابتدا حضرت عیسٰے سے ۳۰ یا ۴۰ ہزار سال پہلے تک واقع ہوئی ہوگی +

(۱۲) یہ نتیجہ ابھی تک پہلا آزمائشی قدم سمجھنا چاہیئے۔ ابھی ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے سوالات کے متعلق ہر ایک علم کی علٰحدہ علٰحدہ تحقیقات اس نتیجے کی کہاں تک تائید یا تردید کرتی ہے +

اگر ناظرین نے مذکورۂ بالا بحث کو سمجھ لیا ہے۔ تو انہوں نے ضرور دیکھا ہوگا کہ ہمارے کرۂ زمین کے انقلابات کی رفتار کس قدر آہستہ اور دھیمی ہے اور یہ بات کچھ اس کی کیفیت نجمی ہی سے خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس کے متعلقہ آثار حیات کی بھی یہی حالت ہے۔ دنیا کے انتظامات کے نقشے اور صورت اور ہر ایک کیفیت زندگی میں ذرا سی بھی نمایاں تبدیلی ہونے کے لئے بیسیوں بلکہ سینکڑوں صدیوں کی ضرورت ہے۔ اس بے انتہا دھیمی مگر نہایت باقاعدہ نجمی نشو و نما اور ترقی کے خیال سے بھی انسانی دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو ان سیاروں کے حجم کی عظمت اور ان کی تعداد کی کثرت کے تصور سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت جلد باز نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت کے کارخانے میں نہ کوئی شے دفعتاً پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ کوئی چیز یکبارگی غائب ہو جاتی ہے۔ نہ صرف اس کرۂ زمین کی ترقی بلکہ تمام اجرام فلکی کی نشو و نما ایسی بطیء الحرکت اور سست رفتار رہی ہے کہ بجز ان کے جن کی بقا کو فنا نہیں اور کوئی نہ اس ترقی کو محسوس کر سکتا ہے۔ نہ ان تبدیلیوں کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ آسان ہے کہ زمین کے مختلف مدارج ترقی کو

ہم سینکڑوں ہزاروں یا لاکھوں برس کے معیار سے شمار کریں۔ مگر انسانی دل و دماغ کی موجودہ حالت میں یہ ممکن نہیں کہ ہم سیاروں کے بچپن۔ طفولیت اور شباب وغیرہ کی مدتوں کا تصور کریں۔ بہرحال تاریخ ارضی اور تاریخ آثار حیات کی ترقی کی سست رفتار ہر شخص کے دل میں پوری طرح جمی ہوئی ہونی چاہیئے۔ جبکہ وہ حیوان ناطق کی ابتدائے آفرینش پر غور کرنے والا ہو۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم تاریخ ارضی کے لحاظ سے عالم حیات کے کون سے درجے پر ہیں۔ کیا ہم عالم حیات کی ابتدا ہی میں ہیں۔ یا وسط کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ یا اس پُر شان مجلس کے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بات یہاں مان لینی چاہیئے کہ ہماری نوع کی زندگی معقول طویل ہوگی۔ یہ بات نہ قیاس میں آتی ہے۔ نہ عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز اور انجام باہم متصل ہی ہو۔ ہر بات جسے ہم جانتے ہیں۔ اور جس پر ہم غور کرتے ہیں۔ ہماری نوع کی عمر طبعی کی درازی اور طوالت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ بجا ہے کہ قدامت انسانی قدامت نباتی کے برابر نہیں ہے۔ مگر اس کرۂ زمین کا منشا (اگر اس کا کوئی منشا ہو۔ جو کہ ضرور ہونا چاہیئے) سوائے اس کے کہ بنی آدم اس پر تصرّف اور تسلّط کریں اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور ہم یہ گمان کرنے کے پورے مجاز ہیں کہ ہماری نوع کا آغاز ماضی میں اور انجام مستقبل میں بہت دور تک پہنچتا ہے ؎

اس سوال کے حل کرنے کے لئے ہم کو پھر اسی اصلی شرط کی طرف پلٹنا چاہیئے۔ جس پر وجود انسانی کا مدار ہے یعنی کیفیّت حرارت۔ حیات انسانی کا ظہور اور حیات انسانی کا قیام ابتدا سے حرارت کی جاں بخش کیفیّت پر مبنی ہے۔ اور انتہا تک اس پر مبنی رہیگا۔ دنیا میں ایک زمانہ تھا۔ جبکہ حرارت ضروریات زندگی سے زیادہ تھی۔ دنیا میں ایک زمانہ آئیگا جبکہ حرارت ضروریات زندگی سے کم ہوگی۔ ہمارا کرہ جو ایک زمانے میں گرمی سے کرۂ نار بنا ہوا تھا آخر میں عالم یخ بن گیا۔ اس کے مسلسل دور سے اس کی اندرونی گرمی کا بڑا حصّہ خارج ہو گیا۔ اور یہ عمل اخراج اب بھی جاری ہے۔ جس طرح اور معمولی جسم زیادہ سرد اشیا کو چھونے سے اپنی گرمی

زائل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی اپنے مدار میں دوڑنے سے اپنی گرمی آہستہ آہستہ ضائع کرتی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کی قیام حیات کی قابلیت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے +

لیکن اس کمی کے پورا ہونے کے دو بڑے ذریعے ہیں۔ اوّل تو خود کرۂ زمین کا اندرونی آتشدان۔ جس نے اس کا تمام اندرونی حصّہ گھیر رکھا ہے۔ اور جو بیرونی سطح زمین کی وجہ سے سربمہر ہو رہا ہے۔ دوسرے آفتاب کی دائمی امداد۔ انسانی زندگی اپنے وجود کے قیام کے لئے مذکورۂ بالا دونوں ذریعے بطور مناسب استعمال کرتی ہے۔ لیکن اس کے قیام اور دوام کے لئے بہترین حالت وہ ہے جبکہ اس کرے کی حرارت برآمد و درآمد برابر ہو۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیات انسانی کا وسطی زمانہ وہی ہو گا۔ اور وہی ترقی انسانی کا کمال۔ اور وہیں سے عروج انسانی کا زوال ہو گا۔ کیونکہ وہ حالت دنیا پر انسانی آبادی کی بہتات۔ انسانی نسل کے قیام اور انسانی زندگی کے طول کے لئے نہایت مناسب اور مفید ہو گی +

اور اگر یہ اعتدال کی حالت قائم رکھی جا سکے۔ تو کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ کیوں نوع انسان ابدالآباد تک یہاں آباد نہ رہے۔ اس نہایت مناسب اور موافق صورت کے پیدا ہونے سے پہلے تمام (محرور المزاج) گرم خون والے جانور جن میں انسان بھی شامل ہے ناموافق اور مضر حالتوں میں ہیں۔ کیونکہ ان کو سطح زمین کی حرارت کی غیر ضروری بیشی سے بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ مثلاً بے قاعدہ نشو و نما۔ قبل از وقت جوانی۔ عصبات کا زیادہ ذکی الحس ہونا اور اس کے ساتھ تیز مزاجی اور زود رنجی۔ اور مختلف کمزوریاں۔ اور اور سینکڑوں خرابیاں جن میں ہم آج کل بھی گرم سیر ملکوں کے باشندوں کو مبتلا پاتے ہیں +

اس کے برعکس جبکہ وہ زمانۂ اعتدال گزر جائیگا۔ جیسا کہ ضروری اور یقینی ہے۔ تو زندگی کی کش مکش اور صورت میں ہو گی +

جب حرارت کا خروج دخول سے زیادہ ہو گا تو آدمی اور بلاؤں میں مبتلا ہو گا۔

Marfat.com

اور قیام حیات کے لئے گرمی کی کمی کو مصنوعی وسیلوں سے پُر کرنا پڑیگا۔ اور انسانی کوششوں کا قیمتی نتیجہ اس قدرتی نقصان کی تلافی میں خرچ کرنا پڑیگا۔

آئندہ زمانے میں آنے والی نسلوں کو یہ مصیبت جھیلنی لازمی ہے۔ اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی محنتیں روز افزوں سردی کی وجہ سے زیادہ دشوار ہوتی جائینگی۔ اس لئے زمانہ اعتدال کے بعد انسانی کمال کا زوال اور قانون قدرت کے مطابق اس کی ترقی کو تنزل ہوگا۔ ہاں اس زمانے تک البتہ ہماری جسمانی اور دماغی طاقتیں (اور خدا کرے ان کے ساتھ اخلاقی حالت بھی) ترقی پذیر ہونگی۔ مگر اس کے بعد ہماری قوتیں رو بہ کمی ہو جائینگی۔ اگرچہ امید ہے کہ بہت آہستہ۔ مگر ضرور۔ کیونکہ قوانین قدرت کی اطاعت سے چارہ نہیں۔ علم ہیئت اور فلسفے نے اپنی متحدہ تحقیقات سے کرۂ زمین کی موجودہ حالت اور حیات انسانی سے اس کا تعلق دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سائنس کی نہایت ہی فاضلانہ معلومات سے اس سوال کا جواب چاہا گیا ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ ہمارا کرہ ہماری زندگی کی مناسبت کے لحاظ سے ابھی درجۂ اعتدال تک نہیں پہنچا۔ اور ابھی پہنچنے میں بہت دن باقی ہیں۔ یعنی ابھی تک حرارت کی درآمد برآمد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ فرق پہلے کے برابر ہرگز نہیں رہا ہے۔ مگر جوں جوں ہم اعتدال حرارت کے مُنتہا کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اُسی قدر بعض موافق اسباب ہمارے پہنچنے کی رفتار کو دھیما کرتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح انسانی ترقی کا میدان وسیع ہوتا جاتا ہے۔ غالباً ناظرین کو ان موافق اسباب کے معلوم کرنے کا شوق ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ آفتاب کی امداد ہمیشہ یکساں ہی رہتی ہے۔ مگر وہ حرارت جو زمین اپنے دَور میں ضائع کر رہی ہے۔ برابر کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ خود اس کا ضائع ہونا اس کے نکلنے کی طاقت کم کرتا جاتا ہے۔ یعنی زمین کی اندرونی حرارت کے ضائع ہونے سے زمین کی اوپر کی سطح زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس طرح زمین ہماری نوع کی درازی عمر کے لئے اپنے قیمتی خزانے کو زیادہ حفاظت سے رکھ سکتی

ہے ۔

غرض مذکورۂ بالا تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ ہم ابھی اپنی زندگانی نوع کے لحاظ سے دنیا کے زیادہ مناسب حصے پر ہیں۔ سوائے ان باتوں کے جو یہاں بیان کی گئی ہیں بعض اور دلیلیں بھی ہیں جن سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ابھی نوع انسان کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور مفید زمانہ نہیں آیا۔ اور یہ صرف علم ہیئت کی ہی تحقیقات نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے زمانے کے تمام نہایت ہی لائق اور قابل تعظیم فاضلوں کی متحدہ رائے بھی یہی ہے کہ ابھی کرۂ زمین کی حرارت کا دخل خرچ سے کم ہے +

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابھی ہماری ترقّی کا زمانہ بہت ہے۔ اور ہم اپنا دل اس خیال سے خوش کر سکتے ہیں۔ کہ ابھی نوع انسانی اپنی بھرپور جوانی پر نہیں پہنچی۔ ہم اس عالم پر اپنے پہنچنے کی رفتار کا اندازہ نوع انسانی کے گزشتہ حالات سے لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہماری ترقّی کی رفتار اب تک ہر طرف سے اس قدر دھیمی رہی ہے۔ کہ تاریخی زمانے کے اندر اندر ہی ایسے وقت موجود ہیں جن میں انسانی زندگی بالکل ساکن یا زیادہ سے زیادہ نہایت ہی ہلکی رفتار سے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض وقت تو بالکل صاف ترقّی معکوس نظر آتی ہے۔ اور اس میں انسان کی جسمانی۔ دماغی اور اخلاقی ہر قسم کی ترقّی شامل ہے +

لیکن اگر ہم ذرا زیادہ وسعت نظر سے کام لیں تو ترقّی معلوم تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر بہت دھیمی۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نوع انسان ادنےٰ درجے سے اعلےٰ کی طرف چڑھ رہی ہے۔ اس کے افراد کی عمریں پہلے سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ عقلیں زیادہ تیز ہیں۔ بالخصوص اشیائے طبعی کے علم میں اور اسباب قدرت کی زبردست طاقتوں کو اپنا مطیع اور اپنے لئے مفید بنانے میں۔ ان کی آرزوئیں زیادہ پاکیزہ ہیں۔ کامیابیاں زیادہ اعلےٰ ہیں۔ مقاصد زیادہ بلند ہیں۔ اور وہ انتظام کائنات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں +

اس جگہ ہم کو پھر خیال آتا ہے۔ کہ جب تاریخی زمانے کے اندر اندر انسانی ترقّی اتنی کم ہے کہ صاف معلوم بھی نہیں ہوتی تو وہ زمانہ جس میں کہ انسان نے

یہ کل ترقّی کی ہے کس قدر ہو گا؟ ریاضی داں کے لئے یہ بات آسان ہے کہ ایک قطعہ دائرہ کو دیکھکر تمام دائرے کی کیفیّت دریافت کر لے۔ اسی طرح ہمارا مذکورہ بیان علم الاقوام اور علم فلسفہ کے فاضل کو ہماری تمام نوع کی ابتدائی کیفیّت بتلانے کے لئے کافی ہے۔

تاریخ ہم کو بنی نوع انسان کے کئی ہزار سال کے حالات سے اطلاع دیتی ہے۔ اور یہ اطلاع اس تاریخی زمانے کے ابتدائی لوگوں کے مختلف کاروبار اور ان کے عادات و اطوار کا سچّا خاکہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض باتوں میں اس تمام عرصے میں بھی کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوئی۔ مثلاً محض دانش و فہم میں آج کل کی ترقّی یافتہ قومیں پرانے زمانے کی اکثر مشہور قوموں سے بڑھنا تو کجا لگّا بھی مشکل سے کھاتی ہیں۔ لیکن اور مختلف امور میں ترقی ظاہر اور صاف ہے۔ مثلاً درازی عمر یا مطالعۂ قدرت میں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مگر بالخصوص سب سے زیادہ ترقّی اسباب معاش اور سامان خوراک حاصل کرنے میں ہوئی ہے۔ آج کل بحر و بر نے اپنے خزانوں کے منہ کھول رکھے ہیں۔ زمین کی قابلیتیں معلوم کر کے ان کو مفید اور کار آمد بنایا گیا ہے۔ اور یہ ام الامہات اپنے بچوں کے پالنے کے لئے ہر فصل اور ہر موسم میں اپنے وسیع دامن کو اپنی بیش بہا نعمتوں سے بھر دیتی ہے۔ اسی طرح علم کی ترقّی اور استعمال میں آج کل کا زمانہ گزشتہ زمانے سے بہت آگے ہے۔ نوع انسانی اپنے گرد و نواح کے قانونوں اور قاعدوں سے واقف ہو گئی ہے۔ اور قدرت دشمن سے دوست بنالی گئی ہے۔ علم طبعیات کے چلتے ہوئے جادو نے ان عنصروں کو جو اتنے دن تک ہمارے بدخواہ سمجھے جاتے تھے۔ ہمارا ہوا خواہ بلکہ فرماں بردار بنا دیا ہے اور سامان معیشت ہر جگہ بکثرت دستیاب ہو سکتا ہے۔

یہ تمام باتیں جن کا ذکر صرف آمد کلام میں ایک اشارہ کی طرح کیا گیا ہے۔ عملاً زمین کی قیام حیات کے لئے بہتر قابلیت کی شہادت دیتی ہیں۔ اور یہ ترقی یافتہ زمانہ اور روزافزوں ترقّی کرنے والے حالات علم ہیئت کے اس مسئلے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر دلیل کا اصلی مقصود اور پورا زور اس بات پر ہے کہ جب

Marfat.com

کئی ہزار سال کی مدت میں انسانی ترقی اس قدر خفیف ہے تو تمام انسانی ترقی کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا۔ اور اس نے کتنا وقت لیا ہوگا۔ ہمارے علم و یقین کے دائرے میں ہر بات اور ہر چیز نوع انسانی کی درازی عمر کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ تمام حالات جن کے زیر اثر ہم اب ہیں۔ یا گزشتہ زمانے میں تھے۔ بڑی سختی سے اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ ہم بقائے نوع کے آغاز یا انجام کے قریب ہیں۔ اگرچہ حیات ارضی کا حیات انسانی سے زیادہ لمبا ہونا بالکل بدیہی اور ضروری ہے کیونکہ جیسے ظہور انسانی سے پہلے لاکھوں کروڑوں برس تیاری کے لئے ضروری تھے۔ غالباً ویسے ہی اس کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں برس اور آنے والے ہونگے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کے آثار باہم اتنے وابستہ ہیں کہ ہم کو بالکل یقین ہے کہ وجود انسانی کا آغاز اب سے گزشتہ کئی سو صدیوں پہلے ہؤا۔ اور اسی طرح اس کا انجام بھی اب سے آئندہ کئی سو صدیوں بعد ہوگا۔ اس جگہ اگر ہم مجملاً منشائے کائنات کا ذکر کریں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ یہاں ہم اس منشا کی تائید کرنا نہیں چاہتے جو گزشتہ صدی کے علمائے مذہبی نے اتنے زور شور سے قرار دے رکھا تھا۔ نہ ہم اور اجرام سماوات اور اجسام کائنات کے بامدعا ہونے کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ جن میں ہمارا یہ کرہ اتنا ناچیز اور بے وقعت ہے۔ انتظام کائنات کی ترتیب ایسی ہی بدیہی اور ظاہری ہے جیسے آثار کائنات کی عظمت و شان اور بوقلمونی و گوناگونی ۔ ع

بچشم مصلحت بنگر صاف نظم ہستی را
کہ ہر خارے دریں وادی درخش کادیاں بینی

اگر وہ چیز جس کو پرانے زمانے کے داستاں گو (Chaos) حالت پریشانی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں کچھ وجود رکھتی بھی ہوگی تو اب مطلق نابود ہے۔ آج کل کی نہایت طاقتور دوربینوں نے نظر انسانی کو ہزاروں لاکھوں میل کی چیز بن دیکھنے کی قوت بخش دی ہے۔ اور ہمارے اس عظیم الشان نظام شمسی کا ایک ذرہ بھی بے ترتیب یا پریشان معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ننھے ننھے تاروں کا حلقہ جو اس میں نظر آتا ہے

غالباً کسی قدیمی کُرے کا مدار یا اُس کے باقی ماندہ ریزے ہیں۔ لیکن ان پر بھی اور تمام چیزوں کی طرح قانون نے اپنا شاہانہ سایہ ڈال رکھا ہے۔ غرض کائنات کی ہر چیز ایک خاص تسلسل کا جزو اور ایک عجیب ترتیب کا حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ مناسبت نمایاں ہے۔ عقل اس پر حکمراں ہے۔ منشا اور مدعا نظر آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کائنات عقل و تمیز اور غایت و غرض کے رہنے کی جگہ ہے +

ہم کائنات میں ایک منصف اور عقلمند ذات کے وجود اور اس کی ترتیب و غرض اور غایت کے آثار کی بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر اس مختصر بیان سے بھی یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ تمام ستارے اور بالخصوص ہماری زمین ہم جیسے ہی جانداران خردمند و با تمیز کا مسکن ہے۔ یہ بات مان لینے کے بعد یہ تسلیم کر لینا بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ عالم دیرپا اور پائدار بھی ہوگا۔ کیونکہ کسی کُرے کو آباد مان کر بھی اس کی ہمیشگی یا کم از کم طویل العمری کو نہ ماننا طبعاً بے معنی اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ آخر کیا وجہ کہ اتنے عظیم الشان سیارے بہترین مخلوق کے رہنے کے لئے بنائے جائیں۔ مگر عارضی اور چند روزہ ہوں۔ **اِن عقلمند حیوانات کے سب سے** **پیچھے آنے اور سب سے جلدی جانے کے لئے قیاس کونسا سبب تجویز کرسکتا ہے ہ**

دیر آمدی ز شاہ رہِ نفتن ــ آئین کدام آشنائیست

اگر مثلاً ہماری زمین میں شروع ہی سے قابلیّت حیات کے آثار اور اسباب موجود تھے۔ جیسے کہ ہمارے خیال میں تمام ستاروں میں ہیں۔ تو ان لا انتہا مدتوں اور کروڑ در کروڑ سالوں کی تیاریوں سے کیا فائدہ۔ جن کا نتیجہ نوع انسانی کا عارضی اور جلد مٹ جانے والا ظہور ہونے والا تھا۔ عقل صحیح تو ہر طرح سے اسی پر زور دیتی ہے کہ ہستی انسانی کا آغاز زمین کی قابلیت رہائش کی ابتدا سے ہوا اور اس کی انتہا تک رہے دانائوں کے ایک خاص فرقے کی یہ منطق بڑی عجیب ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ زمین نوع انسانی کی رہائش کے لئے آراستہ کی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی سرسبز اور شاداب سطح لاکھوں کروڑوں برس تک بیکار اور فضول پڑے پڑے اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ تمام بحث صرف اسلئے کہ چند پرانی سراپا غلط کہانیوں کی تاکید و تائید ہو سکے۔ ہم قدرت کے متعلق

Marfat.com

ایسی کوتاہ بینی اور کم نظری کو یکبارگی نظرانداز کر سکتے ہیں - اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ پرانے زمانوں کی تاریکی اور جہالت کا خیال تھا - کیونکہ قیاس صحیح اور سائنس کی متعلقہ تحقیقات جس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں نوع انسان کے وجودارضی کو زمانہ ماضی اور مستقبل میں محدود کر چکی ہے - اس لئے ہمارا عمرِ نوعِ انسان کی بابت اندازہ یہی ہے کہ وہ ان حدود مقررہ کے اندر اندر پوری طرح پھیلی ہوئی ہے - قیاس اور واقعات سب کا نتیجہ یہی ہے کہ ان حدود میں انسان کے آغاز کے لئے اوّل سے اوّل ممکن تاریخ مقرر کی جاسے - اور اس دنیا میں جس میں دانش اور عقل کی حکومت ہے - عقل کے نتیجے قبول کرنے چاہئیں - اور جس شخص کے دل میں کوئی تعصّب یا پرانی غلط فہمیاں جمی ہوئی نہیں ہیں - اسے مذکورۂ بالا بحث کے قبول کرنے میں کلام نہیں ہو سکتا +

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری عمر نوعی تاریخ ارضی کے ایک معقول گزشتہ زمانے پر حاوی ہے - اور کوئی شخص جو اس عالم میں کسی ترتیب اور غرض کا قائل ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری زمین اور نظام شمسی کا مدعا ہماری نوع کی طول بقا ہے - سب سے آخری بات یعنی یہ کہ ابھی ہماری نسل اپنے درجہ کمال پر نہیں پہنچی - ہم کو سائنس کی تحقیقات کے ہاتھوں قبول کر لینی چاہیئے +

باب سوم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم طبقات الارض کی رائے

اب ہم علم ہیئت کو چھوڑ کر علم طبقات الارض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں ہم خود کرۂ زمین کی ابتدا اور عمر پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ وہ سوال ہمارے موجودہ بیان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم صرف ابتدائے آفرینش انسانی پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ علم بالکل نوایجاد ہے۔ اور باقی تمام علما کی تحقیقات مل کر بھی انیسویں صدی کی معلومات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اب تک ہمارے کرے کی بناوٹ اور اور ساخت قرار واقعی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ لیکن گزشتہ چند دنوں کی کوششوں نے سطح زمین کی کیفیات اور اسکے طبقات کو غالباً صحیح معلوم کر لیا ہے۔ ہم ابتدائے وجود انسانی کا وقت دریافت کرنے کے لئے اس تحقیق کا خلاصہ بیان کرتے ہیں ✦

زمین کی تہ میں ازوآک (Eozoic) یا نیستی کا زمانہ ہے۔ اس کے اوپر دوسرا زمانہ (Palaeozoic) یا ہستی قدیم کہلاتا ہے۔ اس کے اوپر (Neozoic) یا ہستی جدید کا زمانہ ہے۔ جو موجودہ سطح تک آتا ہے۔ اور جس میں حال کے آثار زندگی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ سہولت کے لئے زمانہ ہستی جدید کو پھر دو حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ نیچے کے طبقے کے زمانے کو (Mesozoic) یا زمانہ ثانیہ۔ اور اوپر کے حصے کو (Tertiary) یا زمانہ ثالثہ کہتے ہیں۔ اور اس کے اوپر حال کی سطح کی ساخت کا زمانہ ہے۔ جسے (Quarternary) یا زمانہ رابعہ اور (Pleistocene) یا زمانہ اقربہ کہتے ہیں ✦

اس تقسیم میں وہ بھی شامل ہیں جن کو زمین کے آثار متحجرۂ محفوظہ کے طبقے کہتے ہیں (Fossiliferous) اور جو دنیا کے موجودہ نباتات اور حیوانات سے لیکر زمانہ نیستی کے بے جان طبقوں تک پھیلے ہوئے ہیں ✦

Marfat.com

ان طبقات ارضی کی ساخت اور ان مذکورہ زمانوں کے طول عظیم کی طرف اشارہ کرنا گویا ناظرین کو کم فہم قرار دینا ہے۔ کیونکہ کون ایسا احمق ہو سکتا ہے جو ان کاموں کی بے انتہا آہستگی اور ان زمانوں کی بے حد لمبائی میں شک کریگا +

ابھی تک انسانی کوشش ان زمانوں کی صحیح میعاد معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو اکثر تحقیقات میں مفید ہوتا ہے اور جسکی نئی معلومات سے مناسب تصحیح ہو سکتی ہے۔ ابھی تک اس علم کی ترقیوں کا میدان اتنا پھیلا ہؤا ہے کہ ہر سال اپنے ہمراہ نئی واقفیت اور نئی تحقیق لاتا ہے +

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کون سے ممکن ذرائع ہیں جن سے محقق ان قدیم گزرے ہوئے زمانوں کے امتداد وقت کا علمی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اس بجا شبہ کے جواب میں ہم مثالاً وہ چند واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن کے متعلق تحقیقات ہو چکی ہے۔ اوّل تو یہ کہ زمین کی دائمی تبدیلی جواب بھی برابر اپنا کام کر رہی ہے۔ تحقیقات کے معائنے اور سائنس کے پیمانے سے معلوم کی جاتی ہے۔ سطح زمین کا دھیما مگر دائمی تغیّر۔ اس کی ناہمواریوں کی کمی اس کا مسطح ہونے کی طرف میلان۔ اس کی بعض خاص قسم کے نباتات اور حیوانات کی زندگی کی قابلیّت میں نمایاں فرق اور اور بہت سی باتیں جو اس کے مشہور و معروف آثار ہیں۔ ایک عرصے تک سائنس کی باریک بین عینک سے دیکھے جا چکے ہیں۔ اور اب ان سے گزشتہ اور آئندہ دونوں زمانوں کے متعلق نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قدرت کی یکسانیّت کا بھی ذکر کر دینا چاہئے۔ جس پر حقیقت میں تمام علوم طبیعیات کا مدار اور انحصار ہے۔ ہم بے تامل اس بات کا یقین کر سکتے ہیں کہ وہ قدرتی انقلاب جو ہم آج اپنے اردگرد کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ وہی انقلاب ہیں۔ جنہوں نے زمانہ گزشتہ کے کروڑوں برسوں میں ہماری سطح زمین کو اس کی موجودہ صورت و شکل دی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہم مختلف زمانوں میں اس انقلاب کی یکسانیّت کا دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود تاریخ زمانے ہی میں تجربے اور مشاہدے نے دکھا دیا ہے کہ اس انقلاب کی رفتار

اکثر بدلتی رہتی ہے۔ بعض وقتوں میں یہ تبدیلی زیادہ جلد ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال تاریخ طبقات الارض کی گزشتہ کیفیتوں اور مدتوں کے معلوم کرنے میں طرز انقلاب کے ساتھ رفتار انقلاب کو بھی سائنس کی معلومات کے حوالے کر دینا چاہیئے +

شاید اسی سلسلے میں مذکورۂ بالا عام قواعد انقلاب کی چند عملی مثالیں، دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ مثلاً ایک ایسے انقلاب کی مثال جس سے امتداد وقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وادی نیل کی وہ تہیں ہیں جو سالانہ سیلاب کے ساتھ آکر وہاں جم جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ وادی نیل کی یہ سالانہ خاک تہ نشین نمایاں وبازت رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ یہ سالانہ پرت چوتھائی انچ موٹا ہوتا ہے تو یہ بات بعید از عقل معلوم نہ ہوگی۔ مگر ذرا سے غور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حساب سے وادی نیل مدتوں سے نابود ہو چکی ہوتی۔ اور دریا پھر اپنے منبع کی طرف لوٹ گیا ہوتا۔ ہر سال ایک چوتھائی انچ کے حساب سے ایک صدی میں دو فٹ سے زیادہ موٹی تہ جم جانی چاہیئے۔ اور ہزار برس میں ۲۰ فٹ سے بھی کچھ زیادہ۔ سیزر کے زمانے سے اب تک ۴۲ فٹ کے قریب اور ریمسس (فرعون) کے زمانے سے سو فٹ سے بھی اوپر۔ لیکن اصل امر واقعی یہ ہے کہ تاریخی زمانے کے اندر اندر اس سالانہ خاک تہ نشین سے اس وادی کی بلندی دمیاط کے قریب ۵-۶ فٹ سے زیادہ نہیں بڑھی۔ جس سے فوراً نتیجہ نکل آتا ہے کہ سالانہ پرت معمولی کاغذ کے تختے سے زیادہ موٹا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ نہایت ہی ناچیز پرت جب ایک دفعہ صحت کے ساتھ ماپ لیا گیا تو پھر نہ صرف تاریخی زمانے کے لئے بلکہ تاریخ طبقات الارض کے لئے بھی ماضی اور مستقبل میں یکساں درست اور صحیح معیار ہے۔ ساتھ ہی یہ انقلابات ارضی کی باقاعدگی اور آہستگی کی ایک نہایت پاکیزہ اور عمدہ مثال ہے۔ جن سے زمین کی موجودہ سطح بنی ہے۔ اور یہ حد بندی ہوئی ہے +

مادی تبدیلیوں کے ذریعے سے وقت کی پیمائش کی ایک اور مثال درج ذیل ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ جبکہ تمام کرۂ زمین مائع حالت میں تھا۔ اور اس زمانے میں زمین کی گردش محوری کی رفتار جس قدر تیز ہوتی اسی قدر خط استوا

کے آس پاس کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا۔ اور اگر یہ رفتار بہت زیادہ تیز ہو جاتی تو زمین ایک پتلا پہیہ یا گول طباق بن جاتی۔ اس کے برخلاف اگر یہ رفتار ایسی ہی سست ہوتی۔ جیسی کہ مثلاً ہمارے چاند کی ہے۔ تو خط استوا کے موجودہ فراز کا پتہ بھی نہ لگتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط استوا کے قریب کی بلندی اتنی زیادہ ہے کہ ہماری زمین کی موجودہ رفتار سے اس کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب زمین مائع یا نیم مائع حالت میں تھی اور جب اس کی صورت اس کی گردش محوری کی رفتار پر منحصر تھی اسوقت وہ رفتار موجودہ رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ اور پھر جب سطح زمین جم کر سخت ہو گئی تو پھر زمین کی قطبین پر سے بیٹھی ہوئی نارنگی کی سی کروی صورت اس کی نمایاں سست رفتاری کے باوجود بھی قائم رہی۔ اب علم ہیئت کی تحقیقات اس فرق رفتار کی انتہا معلوم کر سکتی ہے۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد زمین کا موجودہ شکل اختیار کرنے کا وقت معلوم کرنے میں کچھ دقت نہیں رہتی۔ اور وہ زمانہ بآسانی دریافت ہو سکتا ہے جبکہ زمین کا کرہ نیم مائع حالت میں تھا۔ سر ولیم ٹامسن نے فوریئر کے مسئلے پر کاربند ہو کر ایک نہایت طول طویل اور پیچیدہ دلیل سے ثابت کیا ہے کہ اس زمانے کی حد اولے ازمانہ حال سے کم سے کم ۲ کروڑ برس دور ہو چکی ہے۔ یہ بات اس نے ازروے حساب اور مسلمہ اصول طبعیات کے مطابق ثابت کی ہے۔ اس لئے اس کی صحت میں شک کرنے کی کوئی بجا وجہ نہیں ہے لیکن اگر ہم اس مدت کو بالکل صحیح نہ بھی مانیں تو یہ ماننا تو ضرور پڑتا ہے کہ کرۂ زمین کی موجودہ صورت اختیار کرنے کا وقت اس مدت کے قریب ہی قریب تھا جو سر ولیم ٹامسن نے تعین کی ہے۔

لیکن سطح زمین بالکل منجمد ہونے سے پہلے ہی حیات نباتی و حیوانی کا تماشا گاہ بن چکی تھی۔ اور ابتدائی درجے کے جانوروں اور درختوں نے اس کی اس خشک اور سخت ساخت سے پہلے ہی یہاں اپنا عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم طبقات الارض کے لحاظ سے آثار حیات کا اظہار زمانہ نیبتی کے ختم ہونے پر اور اس مدت سے بہت بیشتر ہو گیا تھا جو

سطح زمین کے انجماد کے لئے معین کی گئی ہے۔ اور علما نے اس کل مدت کے تخمینے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ سطح زمین کے اکثر طبقے اسی رفتار سے بنے ہیں جس رفتار سے وہ تاریخی زمانے کی ابتدا سے لیکر اب تک بنتے آئے ہیں۔ تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آثار حیات کا تمام زمانہ انجماد سطح زمین کی مدت سے ۳-۴ یا ۵ گنا زیادہ ہے۔ ڈاکٹر جیمس کرول نے زمین کی سطح بر و بحر پر آثار حیات کے اظہار کی ابتدا کم از کم ۶ کروڑ برس دور خیال کی ہے۔ اور اور بڑے بڑے محققوں نے انہی وجوہات سے اس تخمینے کو کم کرنے کی بجائے زیادہ ہی کیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم ٹامسن نے اس کی حد اونے کو ۱۰ کروڑ برس دور ٹھہرایا ہے۔ لیکن نسبتاً انسان کی نوعمری کے سب علما قائل ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ صحیح ترین تحقیقات اور بہترین معلومات کے لحاظ سے غالباً انسان سب کے پیچھے پیدا ہوا ہے۔ انسانی باقیات صالحات صرف زمانہ ثالثہ۔ زمانہ رابعہ اور زمانہ اقربہ کے بنے ہوئے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم زمانہ طوفانی کے پرے عدم وجود انسان کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ اور ممکن ہے کہ ہم جیسے حیوان زمانہ تاریخ سے پہلے یہاں رہتے سہتے ہوں۔ مگر اس کے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ۔ اور اس کی صحت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ تجربے اور مشاہدے نے یہ بھی دکھایا ہے کہ ذات انسانی کے آثار اور بقیے جلد مٹ کر اپنے عناصر میں مل جاتے ہیں اور اگر انسانی لاش کھلی چھوڑ دی جائے تو چند دن میں قدرتی طاقتیں اسے فنا کر دیتی ہیں۔ یعنی اس کی گیسیں ہوا میں مل جاتی ہیں۔ اور باقی اجزا خاک ہو جاتے ہیں۔ جسم انسانی کو طبقات ارضی کے ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک محفوظ رکھنے کے لئے نہایت ہی موافق اور مناسب اسباب ہونے چاہئیں۔ اور جہاں ایسے اسباب موافق واقعی موجود ہوں۔ جیسے کہ ہم آگے چل کر دیکھینگے۔ وہاں ہماری نوع کے بقیے بالکل صحیح سلامت باقی رہ جاتے ہیں۔ اور ذرا سی بھی تبدیلی ان میں راہ نہیں پاتی۔ اس بارے میں اجسام نباتی و حیوانی میں پوری مطابقت ہے۔ کھلے پڑے رہنے سے گیہوں اور اور پودوں کے بیج چند دن میں ضائع

ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ گیہوں کے دانے جو مصری ممیوں کے ساتھ پائے گئے ہیں۔ ان میں ۳ ہزار برس سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی نشو و نما کی طاقت باقی ہے۔ اور ایسی صرف ایک مثال ہی حیوانات اور نباتات کی حفاظت کا قانون ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے طبقات الارض کے ابتدائی زمانوں کے انسانی بقیوں کی نایابی ان زمانوں میں عدم وجود انسانی کی حتمی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ نایابی کسی اثباتی دلیل کے نہ ہوتے ہوئے محض قیاس کی تردید کے لئے کافی ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہم کو زمین پر ابتدائے انسانی کے لئے زمانہ طوفانی کے بعد کے حالات پر غور کرنا چاہیئے۔ ان اسباب موافق کو واضح کرنے کے لئے ہم کو پھر زمانہ اقربہ کے طبقوں کی خاص خاص کیفیتوں پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ ان بقیوں کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ مناسب جگہ دریا کے قریب کے غاروں کی وہ تہ نشین خاک ہے جو سیلاب وہاں لاکر چھوڑ گئے ہیں۔ یا خود دریاؤں کی اپنی تہ نشین خاک۔ یعنی سنگریزے اور ریت کے اجزا جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اور کھاڑیوں اور خلیجوں یا دریاؤں کے دہانوں کے قریب پھیلے ہوئے میدانوں میں نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ زیادہ دلدار تھوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تیسری مناسب جگہ جھیلوں کی تہ ہے۔ چوتھی جگہ ریت کے وہ ٹیلے ہیں جو بعض جگہوں میں ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا کہیں کہیں سمندر اور ہوا کے متحدہ اثر سے بن جاتے ہیں۔ مگر ان سب جگہوں میں سب سے زیادہ موافق اور مناسب وہی پہلی جگہ ہے۔ ایسے غار اکثر پانی کے کاٹ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ دریا اپنے کناروں پر اندر ہی اندر نرم چٹان یا خاک کی تہ کو کاٹ کر وہاں بڑے بڑے زمین دوز کمرے اور تہ خانے بنا دیتے ہیں۔ اور پھر عموماً چند دنوں

ل وہ نعشیں جو مختلف ادویات کے ذریعے سے سالم و قائم رکھی جاتی تھیں۔ اور جو اب تک بعض مقبروں میں سے ویسی ہی محفوظ برآمد ہوتی ہیں۔ نعشوں کی حفاظت کا یہ طریقہ قدیم مصریوں میں بہت رائج تھا۔ اور حال میں ان کے مطالعہ سے قدیم مصر کی تہذیب و تمدن کا بہت کچھ پتہ لگایا گیا ہے۔

Marfat.com

بعد وہاں سے ہٹ کر اپنی اصلی جگہ آجاتے ہیں - اور ان جگہوں کو بالکل خشک چھوڑ دیتے ہیں - ایسے غار یورپ میں بکثرت پائے جاتے ہیں - کیونکہ وہاں کے اکثر دریا چاک کے طبقوں پر بہتے ہیں - اور یہ طبقے بالخصوص ایسے غاروں کے لئے مناسب ہوتے ہیں - پُرانے زمانے میں چونکہ برفانی دریا آج کل کی نسبت بہت زیادہ چوڑے اور گہرے ہوتے تھے اِسلئے پانی کے زور سے ایسے تہ زمین غار اور لمبی لمبی سرنگیں بکثرت پیدا ہو گئی تھیں +

رفتہ رفتہ زمانۂ طوفانی گزر گیا - دریاؤں کی طغیانی کم ہو گئی - اور پانی کی دھاریں گھاٹیوں کی تہ میں باقی رہ گئیں - ان دھاروں سے گھاٹیاں آہستہ آہستہ کٹتی اور زیادہ گہری ہوتی جاتی ہیں - چنانچہ امریکہ اور یورپ میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ دریاؤں کی دھار بعض دفعہ سطح زمین سے سو سو فٹ نیچے ہوتی ہے - تقریباً ہر ایک بڑے دریا کے دونوں طرف دو دو کڑاڑے نظر آتے ہیں - اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے کڑاڑے دریا کے موجودہ حجم کا نشان دیتے ہیں - اور زیادہ دور کے کڑاڑے پرانے زمانے کے برفانی دریاؤں کی حد بتاتے ہیں - چونکہ پانی کا چڑھاؤ کم ہو گیا ہے - اس لئے پہلے کے بنے ہوئے غار اور گڑھے بالکل خشک پڑے ہیں - ان کے منہ پہاڑیوں میں دریا کے رخ ہیں - اور یہی غار ہوتے تھے جن میں اکثر حیوان اور ابتدائی انسان قدرتاً اپنا ٹھکانا بناتے تھے +

تقریباً ان سب غاروں کی تہ میں باریک ریت اور دریائی مٹی کا پتلا فرش پایا جاتا ہے - اور اس پر چونے اور کاربن کا ایک مرکب جما ہوا ہوتا ہے - جو کچھ حیوانی یا نباتی بقیے یہاں پُرانے زمانوں میں چھوڑے گئے تھے - وہ عموماً دریائی ریت سے ملے ہوئے ہوتے ہیں - اور پھر اس چونے سے گویا ان کا منہ خام کر دیا جاتا ہے - اب یہ سمجھنا سہل ہے کہ اگر دریاؤں کے اس اُتار کی صحیح رفتار معلوم ہو جائے تو اس زمانے کا اندازہ ہو سکتا ہے - جب کہ یہ بقیے ان غاروں میں چھوڑے گئے - اور اسی اعانت کے حاصل کرنے کے لئے ہم نے اس علم کی دقیق تحقیق کی محنت اٹھائی ہے +

یہ بیانات جن کا ذکر آگے بھی کئی بار آئیگا یہاں صرف اس لئے مذکور ہوئے تاکہ زمانہ قدیم کے وقت اور مدتیں معین کر سکنے کا امکان دلنشین ہو جائے +

ناظرین کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ یہ فرش اور ریت بھی جن میں انسانی اور حیوانی بقیے پائے جاتے ہیں بہت وقت میں بنے ہونگے - دریاؤں کے نیچے سنگریزوں اور ریت کی تہ بننے کی دھیمی رفتار نہایت مشاق علما اور لائق فاضلوں نے مشاہدہ کی ہے - عموماً دریاؤں کی رفتار بہت سست ہوتی ہے اور جہاں تیز ہوتی ہے - وہاں بحکم لزوم ہمیشہ پانی نہایت سخت اور دیرپا سنگین چٹانوں کی دیواروں میں گہرا ہوتا ہے - اس لئے عموماً رودخانے بہت آہستہ آہستہ بنتے ہیں - لہٰذا ان عظیم الشان اور گہری گھاٹیوں کو کاٹنے میں کس قدر وقت خرچ ہؤا ہوگا - جن کی تہ میں ہم آج پانی بہتا ہؤا پاتے ہیں - اس وقت کو بجائے سالوں اور مہینوں کے صدیوں اور قرنوں سے ناپنا چاہیئے +

بھی سنگریزے اور ریت جو دریا اپنے راستوں پر سے لیتے ہیں - کہیں کہیں کناروں پر مگر زیادہ تر دہانے پر جمع ہوتے رہتے ہیں - اگر کوئی شخص اس بے انتہا مادے کے جمع ہونے کی پوری مدت کا اندازہ کرنا چاہے تو اسے بچشم خود ان سنگریزوں کے موٹے اور دلدار پرتوں کو دیکھنا چاہیئے - جو پانی سینکڑوں میلوں سے اپنے ساتھ لاکر کوسوں کے پھیلاؤ میں بچھاتا ہے - نہایت مستند اور مسلم علمائے طبقات الارض نے نہایت غور اور توجہ سے اس خاک تہ نشین کے فرش بننے کی رفتار کا اندازہ کیا ہے - اور اگرچہ ان کے نتائج میں بہت اختلاف ہے - مگر ان کی ساخت کی آہستگی اور وقت کی طوالت پر سب متفق ہیں - پس لازم ہے کہ ان انسانی بقیوں کے لئے بھی جو ایسی جگہوں میں دستیاب ہوئے ہیں - بہت معقول قدامت تسلیم کریں +

جھیلوں کی تہوں میں سے بھی بہت سی ایسی اشیا برآمد ہوئی ہیں - ان جگہوں میں اکثر انسانی بقیے ایسے جانوروں کے بقیوں کے ساتھ پائے گئے ہیں جن کو معدوم ہوئے مدتیں ہوئیں - جس کا مفصل ذکر ہم پھر کرینگے - بہرحال یہاں ہم کو وقت کا صحیح اندازہ کرنے میں وہ کامیابی نہیں ہوتی جیسی کہ

Marfat.com

پہلی دو صورتوں میں ہوئی تھی۔ کیونکہ یہاں وہ یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ جھیلوں میں پانی کی آمد اور خاک تہ نشین کی مقدار بالکل غیر معین ہے۔ اور اگرچہ دستیاب شدہ بقیوں کی جگہ۔ اور پانی کی تہ کے نیچے کی گہرائی سے مدت کی طوالت کا خیال کیا جاسکتا ہے۔ مگر علمائے طبقات الارض اس مدت کا صحیح اندازہ کرنے میں پورے کامیاب نہیں ہوئے +

یہی حال ان ریتلے ٹیلوں کا بھی کہنا چاہیئے۔ جو خاص خاص جگہوں میں ملتے ہیں۔ کیونکہ ان کی صورت میں بھی وقت کا اندازہ اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ وہ طاقتیں جن سے یہ ٹیلے پیدا ہوتے ہیں خواہ بحری ہوں یا برّی نسبتاً بہت بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کہ ان ٹیلوں کی موجودہ صورت ممکن ہے۔ کہ صرف ایک زبردست بگولے نے ریت جمع کرکے پیدا کردی ہو۔ یا سینکڑوں ہزاروں برس کی متواتر ہوا نے آہستہ آہستہ بنائی ہو۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ ٹیلے قطعی انسانی محنت کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ یہ ان ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ڈھیر ہیں جو اکثر ابتدائی انسانوں کے جھونپڑوں کے آس پاس پڑی رہا کرتی ہیں۔ ان صورتوں میں مدت کی درازی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ نہایت آباد شہروں میں بھی سطح زمین کے چند فٹ بلند ہونے کے لئے صدیاں چاہئیں اور شہر بھی آجکل کے۔ جہاں تہذیب چیزوں کو ردی بنا کر پھینکنے میں ایسی سرعت سے کام کرتی ہے۔ اس لئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس ابتدائی کم آبادی اور سادہ روی کے زمانے میں ان ٹیلوں کے بننے کے لئے کتنی صدیاں درکار ہونگی۔ اگر ہم نہایت ہی لائق علما کی قیاس کردہ مدتوں کو لیں تو وہاں بھی یہی نتیجہ خیز اور سبق آموز جواب ملتے ہیں۔ سر چارلس لیل جو علمائے طبقات الارض میں سب سے زیادہ لائق اور مشاق ہے۔ اپنی ایک کتاب میں دریائے مسسیپی کے دہانے کی ساخت کی رفتار کی تحقیق کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس پست خاک سیلابی کے فرش کا رقبہ ۱۳ ہزار ۶ سو مربع میل ہے۔ سر چارلس نے مختلف جگہ تحقیقات کرکے اس کی اوسط گہرائی ۵ سو ۲۸ فٹ قرار دی۔ ان معلومات سے اس نے

Marfat.com

دریائے مس سیپی کی لائی ہوئی تمام تہ نشین اشیا کا اندازہ لگایا۔ اور تجربوں سے اس دریا کے ایک مکعب فٹ پانی میں جمادی اجزا کی کمیت معلوم کی۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ حجماً پانی کے تین ہزار حصّوں میں ایک حصّہ۔ اور وزناً ۲۱سو ۴۵ حصوں میں سے ایک۔ ریت۔ مٹّی اور سنگریزوں کا ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں یکسانیت فرض کر کے سر چارلس لیل نے مذکورہ معلومات سے یہ نتیجہ نکالا کہ ۳ ارب ۷۰ کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب فٹ پانی کی سالانہ آمدنی مانکر مس سیپی کے دہانے کی موجودہ صورت بننے کے لئے ۶۷ ہزار برس کی ضرورت ہے +

اس حساب میں بعض بڑے بھاری اور بجا اعتراض ہیں۔ سب سے پہلے اس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ زمانہ طوفانی میں مس سیپی جیسے دریا نہایت چڑھے ہوئے ہوتے تھے اس لئے خاک سیلابی کی مقدار حال کی مقدار سے بہت زیادہ ہوگی۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو برسات میں خود اپنے ندی نالوں اور دریاؤں کی کدورت پہ قیاس کر لینا چاہئے۔ کہ اس زمانے میں مس سیپی کی یہ کدورت زمانہ حال کے جمادی مادوں سے کتنے گن زیادہ ہوگی۔ ہم اس کا درست اندازہ تب ہی کر سکتے ہیں۔ جب ہم اس زمانے میں مس سیپی کی عظمت اور زور کو آج کل کی حالت سے مقابلہ کریں۔ اس زمانے کے بھی بعض بڑے دریا جو زیادہ ڈھلوان وادیوں میں واقع ہیں۔ اپنے پانی کے ساتھ اتنا کچھ سامان بہائے جاتے ہیں۔ کہ ان کے کناروں اور دہانوں پر نسبتاً چند ہی دن میں ریت کے ٹیلے اور سنگریزوں کے کڑاڑے بن جاتے ہیں +

اس لئے یہ خیال کرنا بالکل بجا ہے کہ قدیم زمانے میں مس سیپی کے دہانے کی سالانہ تہ نشین خاک تاریخی زمانے سے بہت زیادہ تھی۔ مگر دوسری طرف ایک دلیل اس کی مدمقابل بھی موجود ہے۔ جس سے اس زیادتی کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب ابتدائی دریا بہت بھرے ہوئے اور بہت گہرے ہوتے تھے تو ان کا بہاؤ اتنا زوردار اور تیز ہوتا تھا کہ وہ اس کدورت کو بجائے دہانے میں چھوڑنے کے دور تک سمندر

کے اندر لے جاتا ہوگا۔ اور مس سیپی کے بارے میں یہ احتمال بالکل بجا ہے۔ کہ اس ابتدائی زمانے کے جمادی مادوں کا زیادہ حصہ تیز دھار اور تند سیلاب کے ساتھ دور خلیج میں جاکر تہ نشین ہوتا ہوگا۔ اس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ آیا زیادہ کدورت اور زیادہ پانی کا زمانہ اس تہ نشین خاک کے فرش کے لئے مفید تھا یا مضر۔ اس خاص بحث کے متعلق دو اور دلیلیں بھی مدنظر رکھنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ اور بڑے بڑے علما کی متفرقہ تحقیقات نے بھی عموماً سر چارلس لیل کے اس نتیجہ کی تاکید اور تائید کی ہے۔ سر جان لبک نے اسی تحقیقات کو از سر نو بطور خود کیا اور قریب قریب بالکل وہی جواب ملے۔ اس شخص نے بعد میں اس تمام بحث کو پھر اپنی کتاب موسومہ "قدامت انسان" میں دُھرایا ہے۔ اور وہاں وہ بجائے اس مدت کو گھٹانے کے اس کے بڑھانے کی طرف زیادہ مائل ہے +

دوسری بات یہ ہے کہ سر چارلس لیل کے نتائج بعینہ ان نتائج کی طرح ہیں جو کرول کے نقشے سے ہم نے برفانی دریاؤں کے پیدا ہونے کی تاریخ کی بابت قیاس کئے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہم نے سردی کی انتہائی شدت کو طریق الارض کی انتہائی لمبائی کے ساتھ اب سے قریباً ایک لاکھ سال پیشتر قرار دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہی زمانہ زمانۂ یخ کہلاتا ہے۔ اس مدت میں سے اندازاً اگر اتنا عرصہ نکال دیں جو زمین اور سورج کے زیادہ موافق موقعوں پر آنے اور پھر اس برف کے بے انتہا پہاڑ کو گلا کر دریاؤں میں ملانے کے لئے کافی ہو۔ تو ہم عملاً اسی زمانے تک آ جاتے ہیں۔ جو علم طبقات الارض کے مس سیپی کے دہانے کا فرش بننے کے لئے قرار دیا ہے +

ہم گزشتہ صفحوں میں کہہ چکے ہیں کہ وادی نیل کی تہ نشین خاک طبقات الارض اور انسانی تاریخ دونوں کے زمانے ماپنے کام آ سکتی ہے۔ اس مضمون پر بڑے صبر اور تحمل سے غور کیا گیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کی رائل سوسائٹی نے ایک مشہور عالم پروفیسر ہارنر کو ۱۸۵۱ء میں اس غرض کے لئے روانہ کیا کہ وادی نیل کی تہ نشین خاک کی رفتار سے مصر کی قدامت کا پتہ

لگائے۔ ہیروڈوٹس[1] کے زمانے میں علمائے مصر یہ بات جانتے تھے کہ قدیم زمانے میں ان کا وادی نیل کا شمالی حصہ بحیرۂ روم کی ایک خلیج تھا۔ اور شہر تھیبس[2] کے سواد تک پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ ان کو خوب معلوم تھا کہ سمندر پانی کے ریلے اور تہ نشین خاک کے پرت کے بلند ہو جانے سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اسلئے وہ کہا کرتے تھے کہ ملک مصر باوانیل کی دَیا ہے۔ اگرچہ ظاہر میں یہ طرز ادا محض پرانی کہانی کی سی ہے۔ مگر فی الحقیقت امر واقعی بھی ہے۔ کیونکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک مصر جو انسانی تہذیب اور شائستگی کے لئے پہلا میدان بنا۔ درحقیقت دریائے نیل کی مہربانی یعنی اس کا نتیجہ ہے۔ ہارنر کے ورود سے پہلے اُن علمانے بھی جو نپولین کے ساتھ مصر گئے تھے۔ چاہا تھا کہ ملک کی قدامت کا پتہ دریا کی تہ نشین خاک سے لگائیں۔ اور انھوں نے ۵ انچ فی صدی کا اندازہ کیا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ وادی میں مختلف جگہ اس کی رفتار مختلف ہے۔ چنانچہ ہارنر نے دو پرانے شہر ہیلیوپولس[3] اور میمفس[4] اپنی تحقیقات کے لئے منتخب کئے۔ ایک میں مشہور مینار کھڑا ہے۔ اور دوسرے میں ٹیمسس[5]

---

[1] (Herodotus) یہ ابو الآباء مورخین عالم یونان کے ایک موضع میں ۴۸۴ سال قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس کے والدین شریف اور معزز لوگ تھے۔ تحصیل علم کے بعد اُس نے اکثر ممالک میں سیر و سفر کر کے جنگ ایران و یونان کی تاریخ ۹ جلدوں میں لکھی۔ جو اس علم کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب غالباً سنہ ۴۳۰ قبل مسیح کے قریب میں تصنیف کی گئی۔ اور اس کے ۵-۶ برس بعد مصنف کا انتقال ہو گیا +

[2] (Thebes) قدیم مصر کا ایک مشہور شہر۔ جو اٹھارویں خاندان فراعنہ کے زمانے میں اپنے انتہائے عروج پر تھا۔ مگر ہومر کے زمانے میں اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آخر اہل بابل و ایران کے حملوں نے اسے بالکل برباد کر دیا۔ اور فتح اسلام کے وقت یہ ایک گاؤں رہ گیا تھا +

[3] (Heliopolis) یعنی آفتاب کا شہر۔ یہ مصر قدیم کا ایک آباد شہر تھا۔ لیکن اب ویران ہے +

[4] (Memphis) قدیم مصر کا دار الخلافہ جسے پہلے تاریخی بادشاہ مصر مینیز (Menes) نے بسایا تھا۔ یہ شہر عرصے تک نہایت آباد اور مشہور شہر رہا۔ اور جب مسلمانوں نے مصر لیا اس وقت تک بھی یہ شہر آباد تھا۔ اگرچہ رو بہ تنزل۔ کیونکہ عربوں نے اس کے مقابل میں دریائے نیل کی دائیں طرف شہر فسطاط آباد کر لیا تھا۔ جس سے رفتہ رفتہ اس کے کھنڈر تک مٹ گئے +

[5] (Ramessis II) سلاطین مصر کے انیسویں اور بیسویں خاندان ریمسائڈ (Ramesside) یا خاندان فراعنہ کا دوسرا اور سب سے زیادہ زبردست اور شاندار بادشاہ جو چودہ سو سال قبل مسیح کے قریب تخت نشین ہوا۔ اور جس نے ۶۷ سال کے قریب سلطنت کی۔ اسی کی بنائی ہوئی عمارتیں مصر اور نوبیہ کی عمارات قدیمہ میں سب سے زیادہ عالیشان ہیں +

Marfat.com

ثانی کا عظیم الشان بت۔ ان دونوں مشہور یادگاروں کی تاریخ بنا تقریباً ٹھیک معلوم ہے۔ مینار تقریباً ۲ ہزار ۳ سو سال قبل مسیح بنا تھا۔ اور ریمسس ثانی کا زمانہ لیپسس کی تاریخ کے مطابق چودھویں صدی قبل مسیح کے زیادہ حصے کو لئے ہوئے تھا۔ ہارنر کا خیال یہ تھا کہ ان دونوں یادگاروں کے پاس سے زمین کھود کر ان چبوتروں تک پہنچے جن پر یہ دونوں چیزیں قائم تھیں۔ اور سطح زمین سے ان کی گہرائی معلوم کرنے کے بعد سیلاب نیل کی تہ نشین خاک کی رفتار آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے یہ معلوم ہوا کہ مینار کی جڑ میں ۴ ہزار ایک سو پچاس سال کے عرصے میں ۱۱ فٹ موٹی تہ بن گئی ہے۔ گویا ہر صدی میں ۳٫۱۸ انچ۔ ریمسس کے بت کے پاس معلوم ہوا کہ سطح زمین اس بت کے چبوترے سے ۱۰ ½ فٹ بلند ہو گئی ہے۔ مگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چبوترہ بناتے وقت خود سطح زمین سے ۱۴۔ ۱۵ انچ نیچے رکھا گیا تھا۔ چنانچہ مناسب کمی بیشی کرنے اور بت کی ۳۲۱۵ برس کی قدامت ماننے کے بعد میمفس میں تہ نشین خاک کے جمع ہونے کی رفتار ۳ ½ - ۱ انچ فی صدی کے قریب ہوئی +

یہ معیار معلوم کرنے کے بعد پروفیسر ہارنر نے وادی میں مختلف جگہوں کو مختلف گہرائیوں تک اور کہیں کہیں خاک سیلابی کی آخری تہ تک کھدوایا۔ چنانچہ ایک جگہ ایک بت کے پاؤں کے پاس ایک مٹی کا برتن سطح حال سے ۳۹ فٹ نیچے دستیاب ہوا۔ مذکورہ معیار کو مانتے ہوئے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس نواح میں نوع انسان اور اس کی صناعیوں کا وجود اب سے ۱۳ ہزار برس پہلے موجود تھا۔ لیکن چونکہ یہ چیزیں بھی خاک سیلابی کی سب سے نیچے کی تہ سے بہت اوپر تھیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وادی مصر ۱۳ ہزار برس سے بھی پہلے خدا جانے کب سے آباد ہو۔ ان دونوں عظیم الشان دریاؤں کے دہانوں کے علاوہ دنیا کے اور مختلف ممالک میں بھی اسی قسم کی تحقیقات کی گئی ہے۔ اور نہ تقریباً بالکل ایسے ہی نتیجے نکلے ہیں۔ سر چارلس لیل نے فرانس میں دریائے سوم کی وادی اور دہانے کی ایسی ہی تحقیق کی اور آخر میں یہی نتیجہ نکالا کہ اس حصّہ

زمین پر بھی نوع انسان تاریخی زمانوں سے کئی ہزار سال پہلے سے آباد تھی۔
ان غاروں کی قدامت کی دلیل جن کی تہ میں انسانی بقیے ملے ہیں بالکل اسی دلیل کے مطابق ہے۔ جو ہم نے دریائی گھاٹیوں کے کٹنے۔ ان کے ہانوں کے پیدا ہونے۔ اور ان کے سنگین کناروں کے بننے کی مدت مدید کے لئے پیش کی ہے۔ کیونکہ دریاؤں نے یہ چیزیں اسی وقت بنانی شروع کی ہونگی جبکہ ان کا عالم یخ کے پگھلنے کے بعد کا طوفان کم ہونا شروع ہؤا ہوگا۔ اور ٹھیک یہی وقت تھا جبکہ کھریا اور چونے کے طبقوں میں وہ غار بن کر پانی کی کمی کی وجہ سے کھلنے اور خشک ہونے لگے ہونگے۔ اور جانوروں اور آدمیوں کی رہائش کے لائق ہوئے ہونگے۔ یہاں ایک بات ضرور ذہن نشین کرینی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ واقعات اس خیال کی تائید نہیں کرتے کہ ان دریاؤں کے اُترتے ہی اور غاروں کے کھلتے ہی آدمیوں نے وہاں رہنا سہنا اختیار کر لیا ہو۔ اس لئے نوع انسان کو ان غاروں کا ہم عمر کہنا غالباً مبالغہ آمیز ہوگا۔ باقی تمام حیثیتوں سے دریاؤں اور غاروں کی خاک تہ نشین میں دبے ہوئے بقیوں کی قدامت کی دلیل بالکل یکساں ہے۔

اس علم کے اصول کے مطابق ان بقیوں کی عمر معلوم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ جو یورپ اور بالخصوص سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کی تہوں میں پائے گئے ہیں۔ جھیل نیوف شیٹل اور بائن کے درمیان مقام پانٹ ڈی تھیل پر نہایت غور اور توجہ سے تحقیقات کی گئی ہے۔ یہ دونوں جھیلیں ایک ندی کے ذریعے سے باہم ملی ہوئی ہیں۔ اور یہ ندی پہلے ایک کھاڑی تھی۔ جو ایک جھیل سے دوسری تک پھیلی ہوتی تھی۔ آخر رفتہ رفتہ ان دونوں جھیلوں کی درمیانی وادی ان طاقتوں کے زیر اثر رہکر جو اب بھی اپنا کام کر رہی ہیں۔ مٹی اور ریت سے پٹ گئی۔ اس سرزمین میں جھیل کے رہنے والوں کے بقیہ آثاروں کا سراغ ملا۔ اور پھر مٹی اور ریت کے جمع ہونے کی رفتار معلوم ہو جانے سے ان جھیل کے باشندوں کے زمانہ وجود کا تحقیق کیا جانا چنداں مشکل نہ تھا۔ یہ دریافت ہؤا کہ سینٹ جین کی خانقاہ جو گیارھویں صدی کے آخر میں پانی کے کنارے پر

Marfat.com

بنائی گئی تھی۔ اب جھیل کے کناروں کے ہٹ جانے سے گویا کنارۂ آب سے ۶۰۰ گز دور ہو گئی ہے۔ پروفیسر گلیرین نے اس تحقیق سے جھیل کے باشندوں کا زمانہ معلوم کیا۔ جن کے گھروں کے کھنڈر اب کنارۂ آب سے ۳ ہزار ۲ سو ۵۰ گز پرے ہٹ گئے ہیں۔ اور یہ نتیجہ نکالا کہ ان آدمیوں کے زمانے کا آخری حصہ کم سے کم ۶،۵۰۰ برس پہلے گزرا ہے۔ ناظرین کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ یہ لوگ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور جن کو جھیل کے باشندے کہتے ہیں۔ اگرچہ تاریخی زمانے کی حد سے پرے ہیں۔ مگر ان کو یورپ کے سب سے قدیم اور ابتدائی رہنے والے ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے +

ایک اور جغرافی شہادت مقام مذکور کے پاس ہی کی ایک جگہ سے ملتی ہے۔ جہاں ایک چھوٹی مگر تیز رَو ندی جھیل جینوا میں گرتی ہے۔ وہاں ریت اور سنگریزوں کا ایک بڑا ڈھیر لگ رہا ہے۔ جو تاریخی زمانے سے پہلے سے ہے۔ یہ ڈھیر مخروطی شکل کا ہے۔ اور حال ہی میں ریل کی سڑک بنانے کے لئے اس کو تقریباً ہزار فٹ کی لمبائی اور ۳۰ فٹ کی گہرائی تک کھود ڈالا ہے۔ اس قابل دید انبار کی ساخت کی رفتار تقریباً صحیح صحیح معلوم کر لی گئی ہے۔ اور انسانی لاشوں کے بقیے اور انسانی کاموں کے نمونے ۱۹ فٹ کی گہرائی پر ملے ہیں۔ مشہور فرانسیسی عالم ایم مارلٹ کی تحقیقات سے ثابت ہؤا ہے کہ اس ڈھیر کے جمع ہونے کے لئے ۷،۰۰۰ سے ۱۱ ہزار سال تک کی ضرورت ہے۔ سر جان لبک نے اس تحقیقات پر پھر از سرِ نو نظرثانی کی ہے۔ اور یہی نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ ایک اور بات جو ان بیانوں کے ضمن میں آچکی ہے۔ اور جو اس کتاب کے اکثر حصوں میں برابر پیش آتی رہیگی۔ یہ ہے کہ کس قدر بعید ملک تحقیقات طبقات الارض کے لئے انتخاب کئے گئے ہیں۔ اور کتنے دور دراز حصوں میں تاریخ سے پہلے کے انسانی بقیوں کا سراغ لگا ہے۔ یہاں ہم صرف علم طبقات الارض کی تحقیقات قدامت انسان پر غور کر رہے ہیں۔ مگر ہم کو یہ بھولنا یا نظرانداز کرنا نہ چاہیئے کہ زمانہ یخ کے بعد کس قدر جلد نوع انسان دنیا کے اتنے دور دور دراز اور مختلف حصوں میں پھیل گئی۔ یہ عظیم الشان پراگندگی خود ہی قدامت

Marfat.com

انسانی کی ایک قوی دلیل ہے۔ اور اگرچہ براہ راست اس کو علم طبقات الارض سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مگر یہ اس علم کے ساتھ اتنی وابستہ ہے کہ دونوں کا ذکر یکجا کر دینا کسی طرح نازیبا یا نامناسب نہیں تھا*

اگر ہم تمام نوع انسان کو متحد الاصل اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہیں تو ہم کو شروع ہی سے اس کی نہایت معقول قدامت کا یقین کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس نوع کی اتنی کثرت اور پھیلاؤ کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا کہ اس کے افراد تمام روئے زمین کے مختلف برّاعظموں مین پھیل جائیں اور برّاعظم بھی ایسے جن کے بیچ میں اکثر ناپید اکنار سمندر اور فلک فرسا پہاڑ حائل ہیں۔ جب ہم ان دور دراز کے ملکوں اور ان کے راستوں کی دشوار گزاری۔ اور ناہمواری۔ اور ابتدائی قوموں کی پیادہ پائی اور آہستہ روی پر نظر ڈال کر اُن کے مختلف باشندوں کی عادات واطوار کی مشابہت اور ان کے مدارج ترقی کی یکسانیت کو دیکھتے ہیں۔ تو ابتدائے انسان کی بے انتہا قدامت ہم کو حیران کر دیتی ہے۔ اور ہم اس طول طویل زمانے کے تصوّر سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ جو ابتدائی آدمیوں کو اپنے مشترکہ مکان سے چل کر ان تمام ملکوں میں پھیل جانے کے لئے ضروری ہوا ہوگا۔ جہاں آج اُن کے مٹے ہوئے نشان اور بوسیدہ ہڈیاں طبقات الارض کی گود سے نکل کر دنیا کو اپنی قدامت اور بزرگی کا ثبوت دکھا رہی ہیں*

باب چہارم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم آثار قدیمہ کی رائے

آثار قدیمہ اور طبقات الارض کے علموں کا باہمی تعلق اس کتاب کے پہلے باب میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم زیادہ محنت اور زیادہ وضاحت سے دکھانا چاہتے ہیں کہ علم آثار قدیمہ ہماری ابتدائے آفرینش کی کیا تاریخ قرار دیتا ہے۔ باوجود لفظی معارضے اور مناقضے کے اس علم کی صحیح تعریف یہی ہے کہ "یہ تاریخی زمانے سے پہلے کی تاریخ ہے"۔ شاید نظر اول میں یہ نتیجہ نکالا جائے کہ چونکہ یہ علم ہم کو بخط مستقیم آثار نسل انسانی کے مختلف درجے دکھاتا ہے۔ اس لئے شاید یہ علم ہیئت اور طبقات الارض کی نسبت زیادہ درستی سے انسانی ابتدا کی تاریخ بتلا سکے۔ مگر معاملہ برعکس ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ابتدائی آدمیوں کی طرز زندگی اور طریق معاشرت کی بابت ہم کو جتنی خبریں اس علم سے ملتی ہیں اتنی علم طبقات الارض سے کیا باقی کل علموں کی متحدہ تحقیقات سے بھی نہیں ملتیں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ تعین وقت کے لئے آثار قدیمہ بالکل طبقات الارض کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ اسلئے تقسیم اوقات میں یہ علم براہ راست کوئی نئی مدد نہیں دیتا۔ بلکہ صرف اور علموں کے دریافت کردہ نتائج کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ مگر ان باتوں سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیئے کہ یہ علم۔ جس کی ترقی اتنے دنوں تک تعصب کی وجہ سے رکی رہی۔ علم طبقات الارض یا اور علوم طبیعی کی طرح محققانہ اور معتبر نہیں ہے۔ بلکہ ہماری نوع کے اُس دور کے تاریک اور بے خبری کے بچپن کے آثار اور بقیوں کا امتحان اس کی ترقی اور ایک حد تک اس ترقی کی رفتار دریافت کرنے کا نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ ذریعہ ہے۔ وہ ترقی جس نے آدمی

کو جانوروں کی وحشیانہ حالت سے تعلیم اور تہذیب کے اس درجے تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اس ترقی کی مختلف مدتوں کی تعیین اور وقتوں کی تحقیق ان طبقات ارضی پر موقوف ہے۔ جن میں وہ آثار اور بقیے پائے گئے ہیں +

ہم یہاں تمہیداً ان اسباب اور مضامین کا ذکر کرتے ہیں جن سے اس علم کا تعلق ہے۔ زمین کے اوپر کے طبقوں میں انسانی بقیے علم طبقات الارض کے زمانۂ طوفانی کے بعد کی اشیا کے ساتھ ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ انسانی ہڈیاں خصوصاً وہ جو زیادہ سخت اور پائدار ہوتی ہیں۔ مثلاً کھوپری اور دانت اتفاقاً یا عمداً ایسی جگہوں میں رکھ دی گئی ہیں۔ جو ان کو صحیح سالم رکھنے کے لئے بالخصوص مناسب ہیں۔ ایسے بقیے ان چٹانوں یا طبقوں میں ملتے ہیں۔ جن کا زمانہ معلوم ہے۔ یا ایسے نایاب جانوروں کے بقیوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جن کے درجے اور مرتبے علم حیوانات قدیمہ مقرر کر چکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ابتدائی آدمیوں کی دستکاری کے نمونے یعنی ان کے اوزار اور برتن جو عموماً نہایت پائدار چیزوں کے ہوتے ہیں۔ اکثر اپنے بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں کی ہڈیوں کے ساتھ بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ چیزیں جن سے ابتدائی آدمی اپنی معمولی ضروریات اور سادہ زندگی کے اسباب بناتے تھے۔ اب تک اسی طرز اور اسی صورت میں باقی ہیں۔ اور اس قدیم ابتدائی زمانے کی بے ہنری اور سادہ رسم و رواج کے نہایت معتبر اور دلچسپ ثبوت ہیں +

ان چیزوں کے انتخاب میں قدرت ان کی رہنمائی کرتی تھی سب سے پہلے انسان نے سیدھے سادھے پتھروں کو جس شکل میں وہ ملے استعمال کیا۔ ان کی اپنی عقل نے ان کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا۔ آخر کار مختلف قسموں میں تمیز اور انتخاب کرنے کی عادت ہوئی۔ اور پتھر کی زیادہ مفید مطلب قسموں کا استعمال شروع ہوا۔ چقماق اور خارا کی تلاش پیدا ہوئی۔ برتن اور ہتھیار بنانے میں ہڈیوں اور سینگوں کو بھی کام میں لانے لگے۔ آخر کار عقل کی ترقی

اور تجربے کی زیادتی سے ابتدائی کاروبار میں دھاتوں کا نمبر آیا۔ برتنوں اور اوزاروں کی ساخت میں پتھروں کی جگہ تانبے اور کانسی نے لینی شروع کی کانسی کے بعد لوہا آیا۔ اور اس کے ساتھ لڑائی کا زمانہ اور تفرقہ قومی کا وقت آیا۔ اور ترقی عقل کے آفتاب کا چمکتا ہوا نشان دیکھکر ظلمتِ جہل کی رات کا رنگ اُڑنے لگا ✦

اس طرح تاریخی زمانے سے پہلے کی قوموں اور زمانوں کی ترتیب نسبتاً آسان ہے۔ مگر اس ترتیب سے مختلف زمانوں کا ٹھیک وقت ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔ اور گو وہ تمام زینے جو ہماری نوع نے انتہائے پستی سے اب تک ترقی میں طے کئے ہیں۔ پوری صحت اور صداقت کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں۔ مگر ان کے مختلف زمانوں کا طول بالکل مشکوک اور مشتبہ ہے۔ بڑی نمایاں بات یہ ہے کہ بعض قومیں میدان ترقی میں اور قوموں سے گوے سبقت لے گئی ہیں۔ چنانچہ اب تک بھی تاریخ عالم کا ایک شعبہ ہم کو ترقی کے تمام مدارج ابتدائی دکھا رہا ہے۔ دنیا کے پردے پر اب تک ایسی قومیں نظر آتی ہیں۔ جو جرأت اور طاقت کے سوا باقی تقریباً تمام حیثیتوں میں ان ابتدائی قوموں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ جو زمانہ ثالثہ کے طبقوں کی بناوٹ کے زمانے میں دنیا میں آباد تھیں۔ اس لئے اگر ہم اپنے پرانے آبا و اجداد کی طرز زندگی کو بچشم خود معائنہ کرنا چاہیں تو ہم کو محض موجودہ دنیا کے بعض حصوں پر نظر ڈالنی کافی ہوگی۔ چنانچہ آسٹریلیا کے اصلی لوگ نیوزیلینڈ کے میوریس مجمع الجزائر کی اور کئی اصلی قومیں۔ نئی دنیا کے سرخ باشندے۔ جو اب تک پٹیگونیا سے انتہائے شمال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب تک ہر قسم کی دھاتوں کے استعمال سے ناواقف محض ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ سیکھا بھی ہے۔ تو صرف چند دن سے۔ اس لئے یہ لوگ بھی ازمنۂ قدیمہ کے وحشیوں کی طرح قرن الحجر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے جب تک آثار قدیمہ کو طبقات الارض سے وابستہ نہ کریں تب تک پرانی دستیاب شدہ اشیاء کی کوئی تاریخ قرار دینا محض ناممکن ہے۔ ہم ان کے باہمی تعلق اور

Marfat.com

ترتیب کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کے وقت کو معلوم نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ فلاں چیز فلاں سے پہلے یا پیچھے کی ہے۔ یا یہ کہ ایک قرن سے دوسری قرن تک ترقی کی رفتار بہت آہستہ ہے۔ مگر آثار قدیمہ کی بابت یہ حکم لگانا کہ یہ چیز کتنی قدیم یا کتنی نئی ہے۔ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے +

لیکن اس قاعدے میں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ خصوصاً وہ جو اقوام قدیمہ کے استخوانی بقیوں کے متعلق ہیں۔ بعض خاص قسم کی بناوٹیں ہیں۔ جو بلاشبہ نہایت قدیم لوگوں کے ساتھ خاص ہیں۔ زمانہ حال کے وحشی وہ نمایاں حیوانی ساخت نہیں رکھتے۔ جن سے پرانے زمانے کے جنگجو وحشی ممتاز تھے +

معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیمہ کے امن پسند حلیم الطبع نرم اور کمزور فرقے ایک حیثیت سے اپنے زیادہ جنگجو اور درشت خو بھائیوں سے زیادہ پائدار اور دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے ابھی تک اپنی خو بو اور طرز و روش کو اسی طرح قائم رکھا ہے۔ حالانکہ وہ قومیں جو زیادہ جنگجو اور دلیر تھیں اپنی عادتوں اور رسموں کو کھو کر آج کل کی ترقی یافتہ اور شائستہ قوموں میں منقلب ہو گئیں۔ بہرحال ان وجہوں سے بعض خاص قسم کے انسانی بقیے اپنی قدامت کا خود ہی اظہار کر دیتے ہیں۔ ورنہ عموماً وہ آلات اور اوزار جن سے قرن[1] الحجر قرن الرصاص سے اور قرن الرصاص قرن الحدید سے ممیز و ممتاز ہوتی ہے۔ ازمنہ قدیمہ کی تاریخیں معین کرنے میں بالکل بے سود اور غیر مفید ہیں +

بعض دفعہ انسانی بقیوں کے نایاب جانوروں کے بقیوں کے ساتھ ملنے سے

---

[1] علمائے علم ارکیالوجی یا آثار قدیمہ نے تاریخ انسانی کے مختلف زمانوں کو انسان کے استعمالی اشیا کے مادوں کے لحاظ سے جدا جدا نام دیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پرانا زمانہ قرن الحجر قدیم (Old Stone Age) کہلاتا ہے۔ کیونکہ خیال ہے کہ اس وقت آدمی نہایت معمولی اور ان گھڑ پتھروں سے اپنا کام چلاتے تھے۔ اس کے بعد کا زمانہ قرن الحجر جدید (New Stone Age) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں آدمیوں کو مختلف قسم کے پتھروں میں کسی قدر امتیاز معلوم ہو گیا تھا۔ اور وہ چقماق وغیرہ سخت پتھروں سے کچھ بھدے بھدے مگر کسی قدر موزوں آلات بنانا سیکھ گئے تھے۔ اس کے بعد قرن الرصاص (Age of Bronze) آیا جس میں دھاتوں کا استعمال بھی آچلا تھا۔ اور سب کے پیچھے قرن الحدید (Age of Iron) آیا جس میں تمام انسانی محنتوں اور صنعتوں کی جان لوہا ہے۔ اور جو ابھی تک جاری ہے۔

ایک اور قسم کی غلطی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں میں وقت کے لحاظ سے بہت قریبی تعلق خیال کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ روے زمین پر جانوروں اور خصوصاً درندوں کی تقسیم میں خود انسانی کاروبار نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ شیر۔ چیتا۔ بجّو وغیرہ خونخوار جانور انسانی تہذیب کے ساتھ اکٹھے ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ نہ صرف ناموافقت آب وہوا کی وجہ سے۔ جیسا کہ عام خیال ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اگر آدمی اور چیتا یکجا ہوں تو دونوں میں سے ایک نہ ایک کا مرنا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہیبتناک پہاڑی شیر۔ پہاڑی ریچھ اور پہاڑی بجّو جو اب نہیں پائے جاتے۔ لیکن جن کے بقیے ابتدائی آدمیوں کے ساتھ ملے ہیں۔ یورپ کے زمانہ یخ سے یا بہت پہلے گزرے ہونگے یا بہت پیچھے۔ کیونکہ اس زمانے کی سردی جبکہ یورپ الپس[۵۱] اور پیرنیز[۵۲] تک برف میں چھپا ہؤا تھا۔ ان جانوروں کے لئے نہایت سخت اور ناقابل برداشت ہوگی۔ جن کا وجود اب صرف ایشیا اور افریقہ کے جلتے ہوئے میدانوں اور جنگلوں میں محدود ہے +

مگر یہ خیال کرتے وقت غالباً یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ چیتا۔ ریچھ بجّو اور شیر بھی آج کے دن تک اچھی طرح ایسی سخت سردی برداشت کرنے کے لائق ہیں۔ جو قطبین کی سردی کے قریب قریب ہو۔ اور یہ جانور اپنے موجودہ مقاموں میں ان کی گرمی کی وجہ سے نہیں گئے ہیں بلکہ تہذیب نے ان کو ان دشوار گزار جنگلوں میں بھگا دیا ہے جہاں نباتات کھانے والے جانوروں کی بہتات درندوں کے لئے سامان خوراک بہم پہنچاتی ہے۔ اس لئے قدیم زمانے میں ان جانوروں کے یورپ میں نہ پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آج کل بھی جہاں کہیں تہذیب نے ان کا راستہ نہیں روکا وہاں ہندی شیر بالکل آزادی سے بارہ سنگھے یا ہرن کے تعاقب میں اپنے جنگل سے نکل کر ہمالیہ کی بلندیوں پر دائمی برف کی حد تک اُن کا پیچھا کرتا ہے۔

---

۵۱ (Alpes) یورپ کا سب سے بلند پہاڑ جو سوئٹزرلینڈ میں واقع ہے۔ اور سترہ ہزار فٹ بلند ہے +

۵۲ (Pyrenees) ایک اور مشہور پہاڑ جو فرانس اور سپین میں حد فاصل ہے +

Marfat.com

اور چیتا۔ بگیرا اور تیندوا تو اس سے بھی گزر جاتے ہیں۔ اور اپنے شکار کا سائبیریا کے برفستان میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان دلیلوں سے ان لوگوں کی غلطی صاف ثابت ہو جاتی ہے۔ جو ان جانوروں کو زمانہ یخ کے بعد کا خیال کر کے ان کے اور انسانی بقیوں کے اختلاط سے نوع انسان کی نو عمری ثابت کرنا چاہتے ہیں ٭

لیکن اس دلیل کے علاوہ بعض آثار قدیمہ میں خود ہی ان کی قدامت کی علامتیں موجود ہیں۔ اس بات پر سب علما متفق ہیں کہ قرن الحجر انسانی ترقی کا سب سے پہلا زمانہ ہے۔ اور پتھر جب انسانی ہاتھ سے ٹوٹے یا کسی حادثے سے۔ تو عناصر کی تاثیر کے لئے ایک نئی سطح نکل آتی ہے۔ اور یہ سطح آئندہ ہمیشہ اس ٹوٹنے کے وقت کی جدت یا قدامت کی خبر دیتی ہے۔ سخت سے سخت اور صاف سے صاف پتھروں کی سطح سے بھی چند سال کے بعد یہ اثر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مصر قدیم کے مستعملہ سنگ خارا کے پیکان ناتجربہ کار دیکھنے والے کو بھی اپنی قدامت کے ناقابل تردید ثبوت دیتے ہیں۔ ہر قسم کے ٹوٹے ہوئے یا صاف کئے ہوئے پتھروں کی چمک رفتہ رفتہ ماند پڑتی جاتی ہے۔ اور آخر کار بالکل معدوم ہو کر کچھ کھُردُری بھوری سی سطح نکل آتی ہے۔ اور اگر خوردبین سے امتحان کیا جائے تو اس کا اور نئی ٹوٹی ہوئی سطح کا فرق اور بھی نمایاں اور واضح ہو جاتا ہے مزید برآں یہ کہ یہ فرق ضرور ہوتا ہے خواہ وہ پتھر ہوا میں پڑا رہے۔ یا زمین میں گڑا رہے ٭

اگرچہ نئے اور پرانے ٹوٹے ہوئے پتھر میں فرق ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر ماہر آثار قدیمہ کے لئے یہ فرق نہایت بدیہی اور ظاہری ہوتا ہے۔ اس کی مشاق آنکھ ہر صفحہ سنگ پر اس کی قدامت کا بیان صاف لکھا ہُوا پاتی ہے۔ اور اگرچہ اس کی ٹھیک تاریخ نہ بتا سکے لیکن اندازاً اس کا زمانہ بتانے میں غلطی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ آسان ہے کہ زمانہ قدیم کی تمام سنگی یادگاروں کو ان کے فرق سطحی کے لحاظ سے مرتب کریں۔ سب سے زیادہ پرانی چیزوں کو جانچ کریں۔ اور پھر قیاس صحیح سے ان میں سے ہر ایک کی عمر کا تخمینہ لگائیں ٭

Marfat.com

علما نے مذکورۂ بالا طریقوں سے ان انسانی یادگاروں کے زمانوں کا اندازہ لگایا ہے۔ جو یورپ میں اب تک ملی ہیں۔ چقماق کے بعض اوزار جو وسط فرانس کے ایک مقام تھینی کے قریب سے نکلے تھے۔ انسانی کاریگری کے سب سے پرانے نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ نمونے اور اس قسم کے اکثر نمونوں سے بڑے ہیں۔ اور غالباً ایک یا دو دفعہ توڑنے سے بنائے گئے ہیں۔ علمائے طبقات الارض نے ان کو زمانہ ثالثہ کے وسط کا قرار دیا ہے۔ ان کے ہم عمر ہی وہ نمونے ہیں جو لزبن کے پاس دریائے ٹیگس سے برآمد ہوئے ہیں۔ فرانس کے علمائے آثار قدیمہ ان کو انسانی دستکاری کے سب سے زیادہ قدیمی نمونے قرار دیتے ہیں۔ مگر اس جگہ بھی ان اشیا کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے اس علم کو ان چیزوں کے آس پاس اور اردگرد کی چیزوں اور طبقوں کی تحقیق کرنی پڑتی ہے۔ صرف علم آثار قدیمہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ اوزار ایک آلات استعمال کرنے والے جانور نے بنائے تھے۔ جو آگ کے استعمال سے واقف تھا۔ اور خود ان کے سطحی آثار تاریخی زمانے سے بہت پہلے پیدا ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کے گردونواح کے طبقات زمینی ان کے بننے کا وقت وسط زمانہ ثالثہ ٹھیراتے ہیں +

ان پرانے اوزاروں کی قیاسی قدامت کا تصور کرتے ہیں ناظرین کو یہ خیال کر لینا چاہیئے۔ کہ ان میں اور ان سے آگے آنیوالے اوزاروں کی کاریگری اور وقت میں بہت طول طویل زمانہ حائل ہے۔ قرین قیاس ہے کہ ان نہایت ہی پرانی یادگاروں کے زمانے اور ان خوبصورت بنے ہوئے چقماق کے پیکانوں اور بھالوں کے زمانے میں جن کو ہم ہر ایک مشہور عجائب خانے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اتنے ہی وقت کا فاصلہ ہو گا جتنا ان پیکانوں اور بھالوں اور قرن الحدید میں +

مذکورۂ بالا سوال کے حل کرنے کے لئے ہم کو پھر عقل و قیاس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہ ابتدائی اوزار جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ انسان اور حیوان میں پہلا مابہ الامتیاز ہیں۔ ان اشیا کی نہایت ادنےٰ اور سادہ کاریگری

بعض قسم کے بندروں کی عیاری اور چالاکی سے صرف ایک زینہ اوپر ہے۔ یہ بات عام ہے کہ بعض قسم کے بندر بھی درختوں میں سے لکڑیاں توڑ کر اپنا حربہ بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اسے کہیں محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں تاکہ ضرورت پڑے تو کام آئے۔ چنانچہ اسے پھر استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر کمی صرف یہ ہے کہ وہ بندر اس لکڑی کو اپنے مطلب کے مطابق اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے قدیم سے قدیم سنگی آلات میں ہم ان پتھروں کا صرف ایک پہلو صاف کردہ پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی آدمی ایسے پتھروں کو تلاش کرتے ہونگے جن کو حادثوں نے کسی قدر درست کر دیا تھا۔ تاکہ ان کو صرف ایک ہی پہلو درست کرنے کی محنت اور تکلیف اُٹھانی پڑے۔ قدیمی آلات میں سے اکثر ایسے ہی ہیں کہ ان کے ایک پہلو کو انسانی کاریگری نے گھڑا تھا۔ اور دوسرا پہلو ویسا ہی رہا۔ جیسا قدرتی اسباب نے اسے بنا دیا تھا۔

یہاں سے متناسب اور موزون پیکان بنانے کا زمانہ بہت دور ہے۔ اگرچہ ترقی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی تبدیلی کا جلد واقع ہو جانا کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ حال کے اکثر آدمیوں نے مختلف چیزوں میں ایسی ترقیاں اور تبدیلیاں چند سال کے اندر اندر ہی دیکھی ہونگی۔ لیکن قدیم دنیا میں یہ حالت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی انسان زندگی کے نئے طریقے اختیار کرنے کے لئے بہت کم تیار ہوتے تھے۔ اور ان کی عادتوں کی ذرا ذرا سی تبدیلی بڑی دشواری اور بڑی مدت کے بعد واقع ہوتی تھی۔ اس مسئلے کی تصدیق کے لئے ہم کو صرف چند باتوں کی طرف توجہ کرنی کافی ہوگی۔

مذکورۂ بالا قسم کے آلات کا دنیا کے دور دراز کے حصوں میں پایا جانا اس مسئلے کی صداقت کی طرف بڑے زور سے اشارہ کرتا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ ان آلات کو استعمال کرنے والے صرف انگلستان اور فرانس ہی میں آباد نہ تھے۔ جہاں آثار قدیمہ کے حاصل کرنے میں نہایت کوشش اور پوری کامیابی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ پُرانے سیدھے سادھے اوزار

دنیا کے ایسے ملکوں میں پائے گئے ہیں۔ جن کے بیچ میں بڑے بڑے پہاڑ۔ فراخ سمندر۔ چوڑے دریا۔ اور ناپیدا کنار صحرا حائل ہیں۔ اسی قسم کی یادگاریں مقام آرییز کے قریب دریائے فون کی رتیوں میں سے اور دریائے پو اور وائیبر پیٹا (واقع اٹلی) میں سے روم کے جنوب تک نکلی ہیں۔ بعض اور نگر بعینہ مشابہ چیزیں دریائے میوز اور شیلٹ (واقع جرمنی) کے کنارے پر سے اور کچھ وسط جرمنی میں سے ہاتھ آئی ہیں۔ اور آگے چلیں تو اسی قسم کی اشیا افریقہ کے دریاؤں اور شمالی امریکہ کی گھاٹیوں میں سے بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ بوسٹن کے ایک پروفیسر ہینز نے ایسی ہی اشیا دریائے نیل میں سے نکالی تھیں۔ ایسے ہی نمونے جنوبی افریقہ کی ہیرے کی کانوں میں سے سطح زمین سے ۴۰ فٹ نیچے پائے گئے ہیں۔ اور کچھ اور مدراس میں سے اور کچھ اور جاپان میں سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی آدمیوں کی وسیع پراگندگی کا ثبوت آثار قدیمہ سے ملتا ہے۔ لیکن اگر ان جگھوں پر غور کریں جہاں سے یہ اشیا دستیاب ہوئی ہیں تو ہم دیکھینگے کہ ہر ملک میں وہ جگھیں بالکل یکساں ہی ہیں۔ ابتدائی باشندے دریاؤں کے کناروں پر اپنے گھر بناتے تھے۔ اور وہیں رہتے سہتے تھے۔ نہایت قدیمی وضع کے سنگین اوزار سوئٹزرلینڈ یا کسی اور زیادہ مرتفع زمین پر نہیں ملے۔ اور نہ ایسی جگھوں میں جو کہ کنارۂ دریا سے دور ہیں۔ اس سے ہم کئی نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اول یہ کہ ان مذکورہ قوموں کی آبادی کا زمانہ وہ تھا۔ جبکہ پہاڑ اور بلند زمینیں برف کی تہ میں چھپی ہوئی تھیں۔ دوم یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں زمین کی ایسی کیفیت تھی کہ ہر جگہ ابتدائی وحشیوں کو گرم سیر مقاموں مثلاً دریاؤں کے کناروں کے قریب مدعو کرتی تھی۔ جہاں سے کہ برف پگھل کر بہ گیا تھا۔ اور پانی ہٹ کر خشک ہو گیا تھا۔ سوم ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ابتدائی باشندے سیر و سفر کے شائق نہ تھے۔ یعنی وہ اپنے مقامات سے اسباب معاش بہم پہنچانے کے سوا اور کسی وجہ سے دور نہ جاتے تھے۔ چہارم ہم مجاز ہیں کہ ان باتوں سے ان کی ترقی کی نہایت ہی سست اور دھیمی رفتار خیال کریں۔ حقیقت میں

ان میں سوچنے یا تصور کرنے کی قابلیت بالکل نہ تھی۔ قرین قیاس ہے کہ ایسی حالت اور ایسے زمانے میں انسانی ترقی نہایت ہی آہستہ بڑھی ہوگی۔ اور اس کا احتمال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ نوع کو اسی بے خبری اور یکسانی کی حالت میں کئی ہزار برس گزر گئے ہونگے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی مدہوشی کے پردے کو ہٹا کر اپنے گرد و نواح کی چیزوں سے واقف ہوئی ہو۔ اور اسے ترقی عقل کی ہوا لگی ہو +

ابھی ایک اور نتیجہ بھی پوری موزونیت کے ساتھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ بعض اشیا کے عدم وجود سے قرن الحجر کی قدامت پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے اور اس کا فاصلہ زمانۂ حال سے کس قدر عظیم ہے۔ ان تمام دستیاب شدہ اوزاروں میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں ملی جو جانوروں کے کھال اُتارنے۔ کھال کو درست کرنے۔ یا ان کو پہننے کے قابل بنانے کے لئے مفید ہوتی۔ اس سے نتیجۂ غالب یہی ہے کہ اس وقت تک ان لوگوں کو مصنوعی طریقوں سے جسم کی حفاظت اور مستوری کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس زمانے کی یادگاروں میں کوئی ایسی شئے بھی نہیں ملی جس سے مردوں کے دفن کرنے کا ثبوت ملے۔ یا جس سے لاشوں کی کوئی عزت و حرمت یا ضعیف الاعتقادی کی کوئی علامت پائی جائے۔ نہ تعویذ گنڈوں کی قسم کی کوئی شئے پائی گئی ہے۔ جس سے اس انسانی زندگی کی نہایت ابتدائی حالت میں کسی مذہبی اعتقاد کا سراغ ملے۔ ہاں یہ البتہ کہا گیا ہے کہ نہایت قدیم اوزاروں کے ساتھ جسمانی آرائش کے لئے خاص قسم کی سیپیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خوبصورتی کے متعلق نوع انسان کے سب سے پُرانے خیالات یہ تھے کہ جسم کو مختلف اشیا سے آراستہ کیا جائے۔ اور ایسا خیال خشیوں ہیں ہمیشہ ان کی آئندہ ترقی کا ایک اچھا شگون سمجھنا چاہیئے۔

اس قدیم پتھر کے زمانے کے بعد نوع انسان کے آبا و اجداد نے نہ صرف اپنے اوزاروں میں بلکہ اپنے دل و دماغ میں بھی ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ اس زمانے کی یادگاروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سوچنے اور تصور کرنے

کی قابلیت پیدا ہوگئی تھی۔ صنعت نے بھی ترقی کی تھی۔ چیزیں سوچ سمجھ کر ایک خاص طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ قرن الحجر کے آخری زمانے ہی میں سلیقہ شعاری اور خوش فکری کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے کی ہر چیز مجلّیٰ۔ مصفّا اور مکمل ہے۔ کم از کم خیالاً وہ بھی ہنر کو سمجھنے لگے تھے۔ چیزیں خود بناتی ہیں کہ ان کے بنانے والے ایک نمونہ ذہن میں قرار دے کر اس کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ گویا قوتِ متخیلہ اچھی طرح کام کرنے لگی تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر قرن الرصاص میں یہ قوٰے اور بھی قوی ہوئے۔ اس زمانے کی یادگاریں حقیقت میں نہایت خوبصورت ہیں۔ نقش و نگار وقعی ہنر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور صنعت گری نے اپنا پورا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ وہ چیز چاقو یا استرے کا پھل ہی کیوں نہ ہو +

یہاں ہم کو ابتدائی زمانے سے بعد کے زمانوں تک کی ترقی کے نمونے دکھانے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم صرف ابتدائی انسان کی تاریخ پر بحث کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھ لیا کہ فی الجملہ آثار قدیمہ بالکل طبقات الارض اور علم ہیئت کا ہم صفیر ہے۔ حقیقت میں ثبوت کا ہر ایک جزو دوسرے کے ساتھ گندھا ہوا ہے۔ اور تمام باتیں ایسی متفق اور متحد ہو رہی ہیں کہ ان علوم طبعیات کی جدّت دیکھتے ہوئے اس کی امید بھی نہ تھی۔ اب اگر ہم علم نباتات قدیمہ کی طرف پھریں۔ تو ہم کو ثبوت میں وہی تصدیق۔ اور تمثیل میں وہی نظیریں پیش آئینگی۔ ہماری اس موجودہ بحث میں ایک یہ خصوصیت ہے کہ علم ہیئت سے شروع کر کے جوں جوں مختلف علوم و فنون کی تحقیقات پر نظر ڈالتے ہوئے اترتے آئیں۔ یہاں تک کہ آخر میں عام علم تاریخ تک پہنچ جائیں۔ تو یہ سب علم ایک دوسرے کے نتائج کے لئے گویا ثبوت کا کام دیتے جاتے ہیں۔ طبقات الارض اپنی تحقیقات میں آثار قدیمہ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آثار قدیمہ اپنے ساتھ نباتات قدیمہ کو ملا لیتا ہے۔ ہم اگر انسانی زندگی کی شہادتوں پر غور کرنے کے لئے ابتدائی آلات۔ اوزار۔ ہتھیار۔ برتن۔ زیور عمارتوں وغیرہ کی تحقیق کریں تو قدم قدم پر ہم کو وہ اشیا بھی ان کے ساتھ ہی ملتی

ہیں۔ جن کا تعلق نباتات قدیمہ سے ہے۔ مگر ہم ان پر بحث کئے بغیر ہی ابتدائے آفرینش انسان کے آثار محفورہ متحجرہ کی شہادت پر غور کرتے ہیں +

زمین کی موجودہ حالت پر صرف ایک نظر ڈالنے سے ہی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سطح زمین کے دو سب سے زیادہ نمایاں واقعات آثار حیات کی نباتی اور حیوانی صورتیں ہیں۔ جو زمین کی سطح پر یا اس کی ہوا اور اس کے پانی میں آباد ہیں۔ ان نباتات اور حیوانات کا سرسری امتحان بھی یہ بتلا دیتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دائمی تغیر کی حالت میں ہیں۔ اگرچہ یہ تغیر بہت آہستہ اور باقاعدہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا ہونا ایسا ہی یقینی ہے۔ جیسا کہ خود ان چیزوں کا وجود۔ روئے زمین پر آثار حیات کی کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ جو امتحان کرنے پر ہمیشہ متغیر ہوتی ہوئی ثابت نہ ہو۔ ہر نوع کے افراد ہمیشہ پیدائش۔ نشو ونما۔ شباب۔ پیری اور موت کے مختلف اثروں اور عملوں سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور خود وہ نوعیں بھی بعینہٖ اپنے افراد کی طرح ٹھیک ایسے ہی طریقوں سے ادل بدل ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نوع کی عمر افراد کی عمر سے بے انتہا بڑی اور لمبی ہوتی ہے +

چنانچہ اس وقت بھی نباتات اور حیوانات کی بعض قسمیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ بعض جوان ہیں۔ اور بعض ادھیڑ۔ اگر ہم سطح زمین کے سب سے اوپر کے پرت کا امتحان کریں تو ہم اس میں آثار حیات کی بہت سی موجود صورتوں کی گزشتہ تاریخ پائینگے۔ مگر اس تحقیق میں ہم بہت دور نہیں جانے پاتے کہ ہم کو بعض نئی قسم کی صورتوں کے معتبر اور ناقابل تردید آثار ملتے ہیں۔ کہ وہ صورتیں اب نایاب ہیں۔ اگر اس تحقیق کو اور آگے لے جائیں اور ان جانداروں کی متحجرہ صورتوں پہ غور کریں تو ہم ان کے آس پاس کے طبقات الارض کے تعلق سے ان کی پوری تاریخ یعنی اُن کی پیدائش۔ شباب اور موت کا سارا حال معلوم کر سکتے ہیں +

لیکن جُوں جُوں ہم سطح زمین کے اندر اپنی کوششوں کو وسیع کرتے ہیں۔ ہم آثار حیات کی اور نئی نئی صورتیں پاتے ہیں۔ جن کا سطح زمین کے اوپر

مطلق وجود نہیں ملتا - بلکہ اس کے اوپر کے پرتوں میں بھی ان کا کچھ نشان نہیں ہے - غرض ہم جہاں تک چاہیں اس تحقیقات کو پھیلاتے اور نیچے اترتے چلے جائیں - یہی صورت پیش آتی جائیگی - اور آخر کار مشاہدہ ہم کو یہ حکم عام لگانے کا اختیار دے دیگا کہ آثار حیات کی تاریخ دوروں کا ایک تذکرہ ہے - کہ یہ دورے زمانہ نیستی سے شروع ہو کر زمانہ حال تک برابر یکے بعد دیگرے صورت پذیر ہوتے جاتے ہیں +

اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ حیات مختلف نوعوں کا ایک دورانی سلسلہ ہے - جو برابر اوپر چڑھتا جاتا ہے - دورانی سلسلہ اس طرح کہ اس میں سے پرانی قسمیں فنا ہو کر گرتی جاتی ہیں - اور نئی قسمیں پیدا ہو کر بڑھتی جاتی ہیں - غالباً یہ سلسلہ دنیا کے قیام تک قائم رہیگا - یہ دورانی سلسلہ ایک دفعہ ثابت ہو جانے کے بعد ایسا ہی بے بدل پایا جاتا ہے - جیسے طبقات الارض کے مختلف زمانے اور گوناگوں انقلاب - اور دنیا کی تاریخ حیات بھی ایسی ہی ناقابل تغیر ہو جاتی ہے - جیسے کہ خود طبقات الارض کی تاریخ +

اس نقطہ خیال سے علم نباتات قدیمہ کا ہمارے اصل مسئلے کے متعلق پورا فائدہ ظاہر ہوتا ہے - ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ نہایت قدیمی سنگین یادگاریں جو ابتدائی آدمیوں کی دستکاری کا نمونہ خیال کی جاتی ہیں اپنے بنانے والوں کی قدامت کا وقت نہیں بتلا سکتیں - کیونکہ خود اس زمانے میں بھی لوہے کے ساتھ پتھر کے آلات کا استعمال روے زمین پر موجود ہے - گویا قرن الحجر اور قرن الحدید دونوں پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں - لیکن آثار حیات کی پرانی صورتیں موجودہ صورتوں کے ساتھ ساتھ ہرگز نہیں ملتیں - ان کے دورانی تسلسل کی ترتیب ہمیشہ یکساں رہتی ہے - خواہ نباتات میں دیکھیں یا حیوانات میں - نئی نسل اور اعلےٰ طرز پرانی اور ادنےٰ کی جگہ لے لیتی ہے - اس طرح اگر ایک دفعہ کسی صورت منجرہ کی صحیح تاریخ اس کے طبقات زمینی کے تعلق سے دریافت کر لی جائے تو یہ علم ہمیشہ آئندہ اس کے متعلقہ صورتوں اور مختلف دوروں کا وقت معین کرنے کے لئے معیار کا کام دیتا ہے +

Marfat.com

غرض اس طرح ازمنہ قدیمہ کے تعین میں پہلے پہاڑی ریچھ کا دورہ ہے۔ اس کے بعد میموتھ کا۔ اس کے بعد رین ڈیر کا اور اس کے بعد پالتو جانوروں کا۔ یہ ترتیب اگرچہ وسط یورپ کے لحاظ سے مقرر کی گئی تھی۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہماری سطح زمین کے لئے ایسی ہی درست ہے۔ جیسے زمین کے مختلف طبقوں کی ترتیب +

اس سلسلہ دورانی کی ترتیب تاریخی زمانے سے پہلے ابتدائے وجود انسانی کے دریافت کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ انسان کو ہمیشہ اور حیوانات موجودہ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ عادتاً انسان اب بھی ایک حد تک گوشت خوار ہے اور وحشیانہ حالت میں تو پورا درندہ تھا۔ اسلئے شروع ہی سے سامان خوراک کے لئے انسان نے اپنے ساتھ کے ہمعصر جانوروں کو شکار کرنا اختیار کیا۔ یہاں ہم یہ سب باتیں صرف اس لئے بیان کر رہے ہیں۔ تاکہ انسانی ابتدا کی تحقیق میں جانوروں کی ترتیب اور اُن کے بقیوں کا فائدہ اچھی طرح واضح ہو جائے +

عالم حیوانات کی ابتدائے عالم سے اب تک کی ترتیب کے علاوہ بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں حیوانی دنیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ کلیہ اصول ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے وحشی جانوروں کی قوت و طاقت اور قد و قامت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور پالتو جانوروں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اکثر جانور جو ابتدائی انسان کے ہمزمانہ تھے بڑے قدآور اور جسیم ہوتے تھے۔ ہم ان میں سے چند عظیم الشان درندوں کا ذکر اشارتاً کر ہی چکے ہیں۔ جو یورپ اور امریکہ میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک خوفناک پہاڑی ریچھ تھا۔ ایک پہاڑی شیر۔ ایک پہاڑی بجو۔ عام طور پر یہ جانور بلی کی قسم کے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ نباتات کے کھانے والے جانور بھی بڑے تنومند اور قوی الجثہ ہوتے تھے اسی زمرے میں وہ عظیم جانور شامل ہے۔ جسے آئرلینڈ کا بارہ سنگھا کہتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کا گینڈا بھی تھا۔ جسکے دو سینگ اور بالدار جسم ہوتا تھا۔

Marfat.com

انہی میں وہ بڑا دریائی گھوڑا بھی شمار ہوتا ہے۔ جس کے ناخلف نمونے اب بھی وادی نیل کی دلدل میں لوٹتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں یہ جانور آج کل کے نمونوں سے بہت زیادہ جسیم اور تند مزاج ہوتا تھا +

غرض یہ تمام جانور درندے اور چرندے آج کل کے ہم قسم جانوروں سے بہت زیادہ بڑے اور مضبوط ہوتے تھے۔ وہ عظیم الشان سخت[له] جلد والے جانور جو سطح زمین کے گرم خون والے جانوروں میں سب سے زیادہ بڑے تھے۔ کمیابی کے ساتھ ہی کمزور اور پست قد بھی ہوتے گئے۔ اور اب تک ہوتے جاتے ہیں۔ سوائے ان چند قسموں کے جن کو انسان نے رام کر کے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لیکن یہ قاعدہ صرف وحشیوں پر حاوی ہے۔ پالتو جانوروں میں معاملہ برعکس ہے۔ وہ بلند۔ قدآور۔ دیوزاد گھوڑے جو آج انسان کی خدمتگزاری کر رہے ہیں۔ زمانہ قدیم کے خچر نما وحشی گھوڑوں کی اولاد ہیں۔ آج کل دنیا میں تمام قدیم زمانوں کی نسبت زیادہ قدآور بھیڑ ہیں۔ بکریاں اور کُتے پائے جاتے ہیں۔ اور اگر گائے بھینسیں پرانے سانڈوں سے قد میں بڑی نہیں ہوتیں۔ تو کم از کم وزن اور طاقت میں اپنے بزرگوں سے کم بھی نہیں ہوتیں۔ یہ دونوں قانون محقق کو انسانی قدامت کے مسئلے پر بحث کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ انسان اور مذکورہ بالا جانوروں کی ہمعمری اور ہمعصری کم از کم طبقہ علما میں مسلم اور یقینی امر ہے۔ اس لئے قدامت انسان کی تاریخ معلوم کرنا اور ان ہمعصر نایاب جانوروں کے زمانے کا سراغ لگانا یکساں نتیجہ خیز ہیں۔ پھر ان جانوروں کا زمانہ گویا کرۂ زمین کی اس زمانے کی عمر معلوم کرتا ہے۔ جس میں یہ جانور رہتے سہتے تھے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں جانوروں کا زمانہ بے ان کے پاس کے طبقات زمینی سے لگاؤ کئے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر ہم کو ان طبقات زمینی کی تحقیق کرنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام

[له] (Pachyderm) دودھ پلانے والے جانوروں کی ایک قسم جو اپنی کھال کی سختی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہوئی۔ قد و قامت میں یہ جانور اپنی مثل نہیں رکھتے۔ چنانچہ ہاتھی۔ گینڈے۔ دریائی گھوڑے وغیرہ سب اسی قسم میں شامل ہیں +

Marfat.com

یہ ہے کہ اس سوال کا زیادہ تر جواب طبقات الارض سے ملتا ہے۔ اور آثار قدیمہ اور نباتات قدیمہ محض اس کی تائید اور تصدیق کرنے والے اجزا ہیں +

باب پنجم

نوعِ انسان کی عمر کی بابت علم انتھروپالوجی کی رائے

اسی طرح رفتہ رفتہ ہم اس علم جدید کی حد تک پہنچتے ہیں۔ جس کو انتھروپولوجی کہتے ہیں۔ اس کے مبحوث فیہ مضامین کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں۔ یہ علم اپنی ابتدا میں نباتات قدیمہ کی ایک قسم یعنی نوع انسانی کی بابت بحث کرتا ہے۔ اور آگے چل کر قدرتی طور پر اس کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ علم الاقوام اور تہذیب الاقوام۔ یہاں اس کے ذکر سے ہمارا مطلب صرف یہ دکھلانا ہے کہ یہ علم بھی تھوڑی بہت روشنی قدامت انسانی پر ضرور ڈالتا ہے۔ مثلاً ہماری نوع کے افراد کی طویل العمری خود نوع کی درازی حیات پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ افراد اور اُن کی انواع کی مدت حیات میں ایک قریبی اور گہرا تعلق ضرور پایا جاتا ہے۔ یقیناً انسان روے زمین کے نہایت طویل العمر جانوروں میں سے ہے۔ اس لئے نوع انسان کی قدامت اور طوالت دلائل عقلی و نقلی سے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے +

اگر علم تشریح و جراحت کے لحاظ سے انسانی ساخت پر غور کیا جائے تو نوع کی بے انتہا قدامت کا سراغ ملتا ہے۔ جسم انسانی میں ایسے بچے ہوئے رگ پٹھے پائے جاتے ہیں۔ جو تاریخی زمانے کی ابتدا سے ہیں۔ مگر جن کا کوئی استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن اگر بعض اور حیوانات کو دیکھیں تو معلوم

ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں بھی رگ پٹھے خوب نشو ونما پا کر پوری طرح کام دیتے ہیں۔ اور یہ امر فلسفہ جدید کے ہاتھوں میں اس بات پر ایک قوی دلیل ہو جاتا ہے۔ کہ فی الحقیقت انسان اور تمام حیوانات متحد الاصل ہیں۔ جن میں آہستہ آہستہ اختلاف اوضاع و اطوار اور مبائنت شکل و صورت پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ خواہ اصل انسانی کی کوئی وجہ قرار دی جاوے۔ لیکن یہ پُرانے عضلات کے بقیہ رگ پٹھے ضرور اور نہایت نمایاں طور پر انسان کی انتہائے قدامت پر دال ہیں +

مناسب ہے کہ اس جگہ ذرا ٹھہر کر ان بقیہ عضلات اور ان کے نتائج پر غور کریں۔ ہر انسان کی آنکھ کے نچلے حصے میں ایک متحرک پردے کا نشان ملتا ہے۔ جو بالکل اس پردے کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ مرغیوں اور بطخوں کی آنکھ میں پایا جاتا ہے۔ اس کا وجود چاہتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ بھی ہو +

مذکورۂ بالا پرندوں میں اس پردے کا کام مردمک چشم کی حفاظت کرنا ہے جسم انسانی میں بھی اس کا اگر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں یہ بالکل بیکار ہے۔ آئندہ زمانے میں اس کا مستعمل ہونا اور بھی زیادہ خلاف قیاس ہے۔ کیونکہ غالباً انسانی ترقی اعضائے انسانی کی محافظت کے لئے اَور اسباب مہیا کریگی نہ یہ کہ موجودہ ذرائع کو بھی چھوڑ کر پھر جانوروں کی طرح قدرت کی محتاج ہو جائے۔ اس طرح غور کرنے سے بجز اس کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ پردہ بھی زمانہ ماضی میں اپنا کام دے چکا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ انسانی شائستگی۔ اور ترقی اور خود اندرون چشم کی زیادہ موزوں اور محفوظ ہو جانے کی وجہ سے ایسے متحرک پردے کی ضرورت کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ یہ پردہ بالکل بیکار ہو گیا۔ اور پھر طبعاً کمزور اور چھوٹا ہونے ہوتے تقریباً نابود ہو گیا۔ ہمارے خیال میں شاید اس کے علاوہ اور کوئی معقول وجہ انسان میں اس بیکار پردۂ چشم کے نشان اور وجود کی

Marfat.com

نہیں بتائی جا سکتی +

اسی پر ہم اور اسی قسم کے اعضا کے بقیہ نشانوں کو محمول کر سکتے ہیں اور ان کا استعمال اور فائدہ ان جانوروں کی بناوٹ پر غور کرنے سے قیاس کر سکتے ہیں۔ جن میں وہ اعضا ابھی تک موجود اور مستعمل ہیں۔ مثلاً کان کو ہلانے کے پٹھے کم درجے کے جانوروں کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ انسان اپنے ہاتھ کو اچھی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ اس لئے اسے ان کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر ان پٹھوں کا بقیہ ابھی تک جسم انسانی میں موجود ہے۔ اور بعض ایسے آدمی بھی ہیں۔ جو ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں تمام نوع آسانی سے ایسا کر سکتی ہو گی۔ یہی حال اور ایسے اعضا کا بھی سمجھنا چاہئے۔ جن کے وجود کا آج تک کوئی معقول سبب بیان نہیں کیا گیا۔ مگر یہ کہ ایک زمانے میں ہمارے پرانے بزرگ ان کو پوری طرح استعمال کر سکتے تھے۔ گو اب امتداد زمانہ کے بعد ضروریات زندگی کے تغیّر و تبدل اور حالات حیات کے انقلابات کی وجہ سے یہ اعضا غیر ضروری ہو کر چھوٹے اور بیکار ہو گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جسم انسانی کے بعض پس ماندہ حصّے مثلاً مردوں کے پستان ایک ایسے دور دراز کے زمانے کا پتہ دیتے ہیں جبکہ اس نوع میں نر مادہ میں بھی امتیاز نہیں ہوا تھا +

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہاں ان بیانات سے مسئلہ ارتقا (ایوولیوشن) کا ثبوت منظور نہیں ہے۔ بلکہ صرف قدامت انسان کے مسئلے کے متعلق علم تشریح انسان قدیمہ کی شہادت حاصل کرنی ہے۔ ہم خود ہی خیال کر سکتے ہیں کہ ایسی عجیب اور حیرت انگیز تبدیلیوں کے لئے کتنا وقت درکار ہو گا۔ ذرا گزشتہ زمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ مصر کے قدیمی نقش و نگار ہم کو اب سے ۵ ہزار برس پہلے کے آدمیوں کی صورت دکھاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ جسم انسانی اپنی موجودہ صورت اس سے پہلے ہی اختیار کر چکا تھا۔ اور تمام اسباب بالامتیاز

پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے۔ کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو کہ اہرام مصری کے بنانے والوں کے یہ اعضا آجکل کے لوگوں سے زیادہ کارآمد۔ طاقتور اور مفید ہوتے تھے۔ گویا اس تفریق اور تمیز کا عمل ۵ ہزار برس سے مدتوں پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خود اس عمل میں کتنا وقت لگا ہوگا۔ اور ہم اس لامحدود زمانے کی بابت کیا کہہ سکتے ہیں جو زن و مرد میں اس تفریق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوگا۔ جس کی بچی ہوئی نشانیاں ہم سے ۵ ہزار برس پہلے کے مردوں میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہیں۔ جیسی آج کل کے لوگوں میں +

آگے چل کر اس علم کی دو نہایت ضروری شاخیں ہو جاتی ہیں ۔ یعنی علم الاقوام ۔ اور تہذیب الاقوام ۔ یا یوں کہو کہ دونوں علم بڑھتے بڑھتے متحد ہو کر تشریح الانسان میں مل جاتے ہیں ۔ جیسے تشریح الانسان علم حیوانات میں ۔ اور علم حیوانات علم الابدان میں +

لیکن حقیقت میں علم الاقوام اور تہذیب الاقوام میں فرق دکھانا ذرا مشکل ہے۔ بعینہ جیسے جغرافیہ اور طبقات الارض کا فرق باریک اور بعض جگہ بالکل معدوم ہے۔ فی الواقع علم الاقوام ۔ تہذیب الاقوام اور تشریح انسان اپنے ضمن میں علم اللغات ۔ علم الفوائین ۔ علم آثار قدیمہ ۔ جغرافیہ اور تاریخ و قصص کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں علموں سے بھی وہی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو ہمارے سوالات سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات جو ہم کو ذہن نشین کرنی چاہئے۔ وہ نوع انسان کا مختلف قبیلوں اور قوموں میں منقسم اور منفرق ہو جانا ہے۔ سیاح جو عموماً ان مختلف انسانی قوموں کو دیکھنے اور ان سے ملنے جلتے ہیں۔ ان میں متحدہ باتیں دیکھنے کی نسبت اختلاف کی صورتیں زیادہ دیکھتے ہیں۔ نوع انسان دریاؤں کے کناروں سے پھیلنی شروع ہوئی ۔ اور تمام روئے زمین پر پھیل گئی ۔ اور جسمانی ۔ دماغی اور اخلاقی ترقی کے تمام مدارج اس کے مختلف ٹکڑوں کی کم و بیش ترقی سے پُر ہو گئے +

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ کب اور کس وقت یہ قومی خصوصیتیں ظاہر ہونی شروع ہوئیں۔ اس کا جواب دینے سے پہلے کم ازکم اتنا پورے یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ یہ اختصاص یک بیک پیدا نہیں ہوئے۔ یعنی وہ فرق اور اختلاف جن سے ایک قوم دوسری قوم سے جدا ہوتی ہے۔ اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے پہچانا جاتا ہے۔ یکبارگی ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ غیر محسوس تغیر و تبدل سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاریخ صرف ایک بات یقینی طور پر بتلا سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ اختصاص اور امتیاز تاریخی زمانے کی روشنی سے پہلے ہی پہلے نمایاں ہو چکے تھے۔ اور تب سے اب تک اتنا بھی نہیں ہوا کہ ان میں کوئی معقول زیادتی ہو کر اس تفرقے کو اور زیادہ واضح اور روشن کرتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ترقّی تہذیب و شائستگی سے وہ گہرے خط و خال جو قوموں کو باہم ممتاز کرتے تھے روز بروز روبہ کمی ہو کر مٹتے جاتے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ علے العموم قدیم سے قدیم قومیں بھی جن سے ہم آشنا ہیں۔ اپنے موجودہ اخلاف کی نسبت باہمی اختلاف زیادہ اور زیادہ نمایاں رکھتی تھیں +

ان باتوں پر تاریخی شہادت لانا بیکار ہے۔ اگر اور کوئی گواہی نہ بھی ہوتی تو صرف مصر اور شام کی یادگاری عمارتیں اقوام انسانی کے پُرانے اختلاف اور تفرقے کے لئے کافی ثبوت ہیں۔ مصر کی قدیم سنگی تصویروں میں ہم کو چار مختلف قوموں کے بالکل الگ الگ نمونے نظر آتے ہیں۔ کہ آج تک بھی ان لوگوں کی شکل و شباہت بعینہٖ ویسی ہی ہے اور ان تصویروں کے خط و خال ایسی صفائی اور احتیاط سے بنائے گئے ہیں۔ گویا ان کو انیسویں صدی کے آخری عشرے کی کسی عالم علم الاقوام نے اپنے مضامین کی توضیح کے لئے بنایا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہرام مصری کی بنا سے پہلے ہی یورپ ایشیا اور افریقہ کی مختلف قومیں اپنی اپنی خصوصیات سے ممتاز ہو چکی تھیں +

عقل صحیح ان مسلمہ باتوں سے دو تین نتیجوں میں۔ سے ایک کے ماننے پر

Marfat.com

مجبور ہے۔ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ انسانی قومیں ایک اصل کی مختلف شاخیں ہیں جو تاریخی معائنے میں آنے سے بہت پہلے پیدا ہو چکی تھیں۔ اور ان کے تمام اختلاف اور امتیاز کے اسباب اس تاریخی زمانے سے قبل کی مدت مدید میں نمایاں ہو گئے تھے۔ یا یہ فرض کیا جائے کہ انسان دنیا میں مختلف جگہ جدا جدا حالات میں الگ الگ اصلوں سے پیدا ہو گئے۔ اور جب یہ لوگ تاریخی زمانے کی روشنی میں ہم کو نظر آئے تو اختلاف احوال اور تفرقہ اصول کی وجہ سے ایک دوسرے سے متمیز و ممتاز۔ اور وہی خصوصیات لئے ہوئے نظر آئے۔ جو آج تک ان میں اسی طرح موجود ہیں۔ ایک تیسرا قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم کے کسی حصّے میں مختلف قوموں کے اجداد دفعتاً اپنی اصل سے شکل و شباہت میں مختلف ہو گئے ہوں۔ جیسے سگے بھائی بہن جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ ایکدوسرے سے صورت شکل میں نہیں ملتے۔ غرض اس قسم کے قیاسات اور بھی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں اس مسئلے کی متفرق صورتیں دکھلانے کے لئے یہی کافی ہیں +

موجودہ زمانے میں جو اصول طبعیات سے اتنا آگاہ اور عالم امکان میں اسباب و نتائج کا اتنا معتقد ہے۔ یہ کہنا محض غیر ضروری ہے کہ مذکورہ قیاسات میں سے صرف پہلا ہی صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہم اقوام انسان کے متحدالاصل یا مختلف الاصل ہونے پر بحث نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تک ہم ترقی زندگی کے باقاعدہ اور باترتیب انقلابات سے واقف ہیں۔ وہاں تک ان قومی خصوصیات کی صرف ایک ہی معقول اور قرین قیاس وجہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت قدیم زمانے میں جس کی مدت ہزارہا ہزار سال سے بھی پرے تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک خاص صورت کے آدمی دنیا میں پیدا ہوئے۔ اور آئندہ زمانے کے انقلابات سے۔ لیکن تاریخی زمانے کی ابتدا سے بہت پہلے۔ ابتدائی آدمیوں کی قومیں نہایت آہستہ آہستہ اور بالکل غیر محسوس مدارج سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتی گئیں۔ اور سفر کی وجہ سے طرح طرح کی آب و ہوا

اور وضع وضع کے مقامات میں رہتے رہتے نئے نئے اوضاع و اطوار اور اَور اَور خط و خال پائی گئیں۔ جن لوگوں نے اس قسم کے معاملات پر غور کیا ہے۔ وہ ان انقلابوں کی آہستہ روی۔ اور ان تبدیلیوں کی دھیمی رفتار کو خوب جانتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے غور نہیں کیا وہ آسانی سے اس کا قیاس اور تصوّر کر سکتے ہیں۔

اس طرح یہ علم قدامت انسان کا اندازہ لگانے کے لئے ایک معیار مہیا کر دیتا ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مصری تصویریں ہم کو کم از کم ۵ ہزار برس پہلے کے صحیح قومی نقشے اور چہرے مُہرے دکھاتی ہیں۔ ان کو ان کے موجودہ نمونوں سے ملانے سے ہم کو اس قسم کے انسانی تغیر کی رفتار کا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ وحشیانہ حالت کی نسبت تہذیب کے زمانے میں یہ رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اگرچہ قیاس اس کے برعکس چاہتا تھا۔ چنانچہ مصریوں کی بنائی ہوئی حبشی تصویر اور آج کل کے زندہ نمونے ہیں گویا کچھ بھی فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن آج کل کے قبطی جن پر اتنی مختلف تہذیبوں اور اتنے متفرق تاریخی اثروں نے رنگ ڈالا ہے۔ اپنے پرانے مصری آباؤ اجداد سے خط و خال میں بالکل نہیں ملتے۔ اسی طرح زمانہ حال کے یونانی اور اطالی۔ یونان اور اطالیہ کے قدیم باشندوں سے کئی باتوں میں مختلف ہیں۔ مگر ایشیا کے جنگلوں میں رہنے والے اور امریکہ کے اصلی باشندے کئی ہزار سال میں بھی اپنی پرانی صورت سے نہیں بدلے یہ قاعدہ اس زمانے کی مدت کو گھٹانے کی بجائے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ جو ان مختلف اقوام انسانی کو اس قدر متغیر ہونے کے لئے ضروری ہوا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وادی مصر میں یقیناً۔ اور وادی اٹک اور وادی فرات میں غالباً اب سے ۵ ہزار سال پہلے تہذیب پوری طرح اشاعت پا چکی تھی۔ اس لئے اس کا اثر قومی خط و خال کے بدلنے میں ضرور پڑا ہوگا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم نوع انسان کی تمام مختلف اقوام کے ظاہری اختلاف کے لئے اس عرصے سے ۵ گنا وقت قرار دیں تو غالباً کچھ

مبالغہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ اندازہ بالکل صحیح نہ بھی ہو تو اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ یہ قیاس صحت کے بہت قریب ہے ÷

انسانی قدامت کے ثبوت کا انحصار صرف اس اختلاف ظاہری پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی قوموں کی تمام سطح زمین پر پھیلانے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ تاریخی زمانے کے اندر بجز چند جزیروں کے عموماً اور کوئی ملک یا کوئی قطعہ زمین غیر آباد نہیں ملا۔ پندرھویں صدی میں جزائر غرب الہند کا کچھ کچھ حصہ ویران تھا۔ اور مجمع الجزائر ایشیا کے چند جزیرے غیر آباد ملے۔ باقی تمام دنیا زمانہ قدیم سے ہی آباد پائی گئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہزارہا سال پہلے کے آنے والوں نے بھی اس ملک کو اپنے آپ سے زیادہ پرانی قوموں سے بسا ہؤا پایا۔ جب آریا نسلوں کی عظیم الشان لہر وسط ایشیا سے اُٹھی۔ تو انہوں نے بھی اپنے آگے کسی ملک کو غیر آباد نہ پایا۔ غرض جہاں تک تاریخی روشنی ہم کو زمانۂ قدیم کے حالات دکھانے کے لائق ہے۔ وہاں تک صرف یہ تمام روے زمین کی آبادی ہی ایک ایسی بات ہے۔ جس میں کوئی استثنا نہیں ملتی۔ ابتدائی قوموں کی یہ ابتدائی اور عظیم الشان پراگندگی قدامت انسانی کی ایک زبردست دلیل ہے اور یہ قدامت اور بھی زیادہ قدیم معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم ان نیم وحشی لوگوں کے سفر کی دقتوں اور راستوں کی صعوبتوں کی بابت خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے نقل مکان کرنے میں کس قدر قدرتی موانع اور مصائب کا سامنا ہوتا ہوگا۔ یہ عام خیال ہے کہ قومیں مل کر سفر کرتی تھیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اگرچہ بعض بعض اوقات خاص خاص حالتوں میں ابتدائی آدمی مجموعاً اپنے پہلے مسکن کو خیرباد کہکر دفعتہً واحدۃً نئے ملک ۔ نئے جزیرے ۔ بلکہ نئے برّاعظم تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن ایسا شاذ ہوتا تھا۔ اور نفس الواقع بنی آدم کا سطح زمین پہ پھیل جانا سفر اور نقل مکان سے نہیں ہؤا۔ بلکہ پراگندگی اور فراق سے ہؤا ہے۔ یعنی ہماری نوع دنیا میں اس طرح نہیں پھیلی۔ جیسے بعض پرندے تبدیل مقام کر کے دوسری جگہ جا بستے ہیں۔ بلکہ ایسے بڑھی ہے ۔

Marfat.com

جیسے کوئی بیل کسی درخت کی ڈال ڈال شاخ شاخ پر چھا جاتی ہے۔ مگر ایسے آہستہ آہستہ کہ کوئی نظر اس کو بڑھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی۔ اور کوئی شخص اس کی رفتار کو محسوس نہیں کر سکتا۔ مگر چند دن کے بعد دیکھیں تو بیل زیادہ بڑی اور پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ابتدائی انسان بھی روے زمین پر پھیلے ہیں۔ ہاں اگر اس طرح پھیلنے والے خاندانوں کے آگے بڑھے ہوے افراد کو کوئی ایسی جگہ مل جاتی تھی جو واقع میں زیادہ موزون اور مناسب ہوتی تھی۔ تو پھر البتہ تمام خاندان کی حرکت اس طرف تیز ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کل نیا مقام آباد ہو کر اپنے منافع ان لوگوں کی نذر کر دیتا تھا۔ اس طرح قیاس صحیح ہم کو ابتدائی آدمیوں کی شروع شروع کی پراگندگی اور ترقی کا نقشہ دکھاتا ہے۔ ان کے حدود کا پھیلاؤ بالکل اُس دریا کی طرح ہوگا۔ جس کا پانی بالکل ساکن معلوم ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر یہاں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ باوجود اس قدر سست روی کے ان ابتدائی قوموں کو تمام روے زمین پر پھیل جانے کے لئے کتنا وقت ضروری ہؤا ہوگا۔ اور اس سے مسئلہ قدامت انسانی پر کیا کچھ اثر پڑیگا۔ مثلاً خیال کرنے کی بات ہے کہ آدمیوں کو اپنی وحشیانہ حالت اور ابتدائی طرز سفر کی وجہ سے بحر الکاہل کے تمام جزائر اور براعظم امریکہ۔ اور آسٹریلیا جیسے دور دراز ملکوں میں پھیل جانے میں کیا کیا دقتیں اور کیسی کیسی آفتیں پڑی ہونگی۔ اور مسافت کے علاوہ خود قدرتی رکاوٹوں اور جغرافی کیفیتوں نے ان کو کتنی دفعہ ناکام اور دل شکستہ لوٹایا ہوگا۔ اور آخر کتنی مدت اور کس قدر زمانے کے بعد ان تمام موانع سے گذر کر انھوں نے اپنی اپنی منزل مقصود کو پایا ہوگا۔ اس کا جواب صدیوں اور قرنوں میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہزارہا ہزار سال کی ضرورت ہے +

چند اور باتیں بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں۔ جن سے فطرتاً اس انسانی پراگندگی میں تاخیر ہوئی ہوگی۔ اوّل تو یہی کہ یہ کام ابتداے زمانہ تہذیب

Marfat.com

سے مدتوں پہلے تمام ہو چکا تھا - یعنی اسی زمانے میں جبکہ ترقی کے کاروبار نے ملکوں کو صاف اور شائستگی کے معمار نے راستوں کو ہموار نہیں کیا تھا - اور ابتدائی آدمی ابتدائی حالت میں اس ناہموار اور دشوار گزار دنیا میں بستے تھے - آج کل کے آدمی اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ابتدائی آدمیوں کو ان کی وحشیانہ حالت میں چھوٹے سے دریا کے عبور کرنے میں بھی کیا کیا مشکلیں پیش آئی ہونگی - یہ بھی مان لیجئے کہ وہ لوگ تیرنا جانتے تھے - مگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک تیز اور چوڑے دریا کے پار اتارنا اُن کے لئے تقریباً محال ہو گا - اس میں شک نہیں کہ ناؤ اور کشتی کا استعمال انسان کی ابتدائی حالت ہی میں رائج ہو گیا تھا - لیکن بہرحال ایک وقت ضرور تھا - جبکہ ابتدائی وحشیوں نے ان چیزوں کے بنانے کی ترکیب ایسے ہی ہوے ہوے - آہستہ آہستہ - رفتہ رفتہ - درجہ بدرجہ - ٹھہر ٹھہر کر - ڈرتے ڈرتے سوچی ہو گی - جیسے ترقی کے زمانے والوں نے ریل اور دودی جہازوں کی - بلکہ غالباً اس سے بھی زیادہ مشکل سے - فی الواقع تاریخی زمانے سے پہلے انسانی ترقی کے نہایت معمولی مدارج بھی ایسی ایسی مشکلات شکوک - محنتوں - کوششوں اور ناکامیوں کے بعد طے کئے گئے ہیں کہ اُنھوں نے اس ترقی کو بے انتہا اور لامحدود زمانے تک نمایاں نہ ہونے دیا ہو گا - قدامت انسان کے تمام تخمینے اور اندازے جبتک کہ ان میں ان تمام باتوں کو مدنظر اور ذہن نشین نہ رکھا جاے - اصولاً غلط ہیں - پرانے زمانے میں روے زمین پر ایک بھی عمدہ راستہ نہ تھا - قدرت سڑکیں تیار نہیں کرتی - پُل نہیں بناتی - اسی ضمن میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس تمام پرشکوہ اور جنگجو دنیا میں جس کا خاکہ مصر - ہندوستان - یونان کارتھیج[1] - اور رومتہ الکبرے کی قدیم تاریخ دکھاتی ہے - ایک بھی سرنگ یا زمیں دوز راستہ نہیں تھا - اس زمانے کے لوگوں نے نہریں پُل - بدرروئیں

[1] (Carthage) شمالی افریقیہ کا ایک قدیم اور مشہور شہر جہاں اب شہر تونس آباد ہے - اس کی جگہ تجارت اور آمدورفت کے لئے نہایت موزوں ہے - یہ شہر اہل فونیشیا نے نویں صدی قبل مسیح میں روما کی بنا سے سو سال پیشتر آباد کیا تھا ؛

تہ خانے۔ پانی کے نہ زمین راستے تو سب کچھ بنائے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسے آدمی آج کل کی سی زمین دوز سڑک نہ بنا سکتے۔ مگر یہ کام نہ سکندر[1] اور سیزر[2] کے زمانے میں ہوا۔ نہ جسٹینین[3]۔ شارلمین[4]۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید کے عہد میں ہوا۔ نہ الزبتھ۔ اکبر اور لوئی کے سامنے ہوا۔ یہاں تک کہ نپولین کے وقت میں بھی نہ ہوا۔ بلکہ صرف انیسویں صدی کے معماروں اور انجنیروں نے ہی انسانی آمدورفت کی تیزی اور آسانی کے لئے زیر زمین راستے بنانے میں کام کیا۔ ہم اس سے پہلے کئی بار اشارہ کر چکے ہیں کہ سمندروں اور نہروں نے ان لوگوں کو بہت دن تک روکے رکھا ہوگا۔ ابتدائی انسان ان کو کس عظمت اور شان کی نظر سے دیکھتے ہونگے۔ اور ان کے سامنے اپنے آپ کو کس قدر

[1] سکندر یونان کا مشہور معروف پادشاہ جس نے ۳۳ سال کی عمر ہی میں تمام ایشیائے کوچک ایران۔ توران و ہندوستان اور مصر وغیرہ ملک فتح کر لئے۔ اور جو اگر زیادہ جیتا رہتا تو غالباً تمام دنیا کو مسخر کر لیتا۔ اس کا زمانہ ۳۰۰ سال قبل مسیح کا ہے۔

[2] (Julius Cæsar) ۱۲ جولائی سنہ ۱۰۰ قبل مسیح میں روما کے ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوا۔ اور چونکہ اس کو اس کی ماں کا شکم چاک کر کے نکالا گیا تھا۔ اس لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ شخص نہ صرف سلطنت روما کا بلکہ تمام دنیا کے زمانہ قدیم کا سب سے بڑا آدمی گزرا ہے۔ اور یہ امر بے وجہ نہیں کہ اس کا نام اب تک دو ہزار برس بعد بھی تمام دنیا کے ملکوں میں سب سے بڑا لقب ہے۔ جرمنی اور روم اور چین کا قیصر اور روس کا زار اسی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ اگرچہ تاریخ اس شخص کو بہت سے لباسوں میں دکھاتی ہے۔ مگر جہاں تک غور کیا جائے اس کی عظمت و شان دماغ پر زیادہ اثر کرتی جاتی ہے یہ شخص ایسے وقت میں پیدا ہوا جبکہ روما کی سلطنت خود اپنی وسعت کی وجہ سے ٹوٹنے والی تھی مگر اس نے اسے سنبھالا۔ اور ایسا سنبھالا کہ اس آئینی سلطنت کو اپنی پشتینی جاگیر بنا لیا سنہ ۵۸ قبل مسیح کے قریب میں اس نے جنگ فرانس کے متعلق دو مشہور تشریحات (Commentaries) لکھیں جو اب تک اپنی فصاحت اور صحیح تاریخ کی وجہ سے بے نظیر ہیں۔ سنہ ۶۳ میں اسے روما کا اسقف اعظم اور سپہ سالار افواج بنا دیا۔ اس کے بعد سنہ ۶۰ سے سنہ ۴۵ قبل مسیح تک وہ مختلف فتوحات میں مصروف رہا۔ اور اس نے مصر۔ افریقہ۔ فرانس اور انگلستان تک فتح کر ڈالا۔ اور اپنے تمام مخالفین کو زک دی۔ اور آخر وہ شہنشاہ بن گیا۔ مگر اس کے چند ہی دن بعد سنہ ۴۴ قبل مسیح میں وہ سینٹ کے ایک جلسے میں دو فتنہ پرداز مخالفوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جن کی بابت اٹلی کا نامور شاعر ڈینٹی (Dante) کہتا ہے کہ دنیا میں شیطان نے تین صورتیں اختیار کی ہیں۔ دو صورتیں ان دونوں قاتلوں کی جنہوں نے اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے ساتھ دغا کیا۔ اور ایک اس مکار حواری کی جس نے اپنے آقا حضرت عیسیٰؑ کو یہودیوں کے سپرد کیا۔

[3] (Justinian the Great) سلطنت قسطنطنیہ کا سب سے بڑا اور نامور بادشاہ سنہ ۴۸۳ع کو پیدا ہوا۔ چند دن

بے وقعت اور ناچیز خیال کرتے ہونگے۔ اب بھی جبکہ جہازوں اور کشتیوں نے سطح سمندر کو اپنی دائمی آمد و رفت سے خشکی کے شارع عام کی طرح آباد کر رکھا ہے۔ انسان اس کی بے انتہا گہرائی سے فطرتاً جان چرا کر کونوں میں چھپتا ہے اور کناروں پر چلتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ابتدائی زمانے میں سمندروں بلکہ جھیلوں اور دریاؤں تک کا ناقابل عبور ہونا ایک موروثی خیال تھا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ دلوں میں بیٹھتے بیٹھتے مذہبی عقیدت کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اور ایسے موروثی خیالات کا جو کچھ روکنے والا اثر نہ صرف انسانی دل و دماغ پر بلکہ انسانی جسم پر ہوتا ہے۔ اس کا اگر کوئی علم کچھ اندازہ کر سکتا ہے تو وہ علم تاریخ ہے۔ مگر یہ بھی صحت کے ساتھ نہیں۔ ہم اکثر پاتے ہیں کہ قومیں آگے بڑھتے بڑھتے یکایک

(بقیہ صفحہ ۸۵) بعد اس کے لاولد چچا جسٹن نے اسے متبنےٰ بنالیا۔ اور یہی اس کی وجہ ترقی ہوئی۔ اوائل عمر ہی میں وہ قسطنطنیہ آیا اور ۵۱۸ء میں جب اس کا چچا تخت نشین ہوا تو جسٹینین گویا تمام سلطنت کا مالک ہوگیا۔ اور ۵۲۷ء میں اپنے چچا کے انتقال کے بعد حاکم بالاستقلال ہوگیا۔ اور ۵۶۵ء تک حکمراں رہا۔ اس کا زمانہ اپنی پرشکوہ فتوحات۔ قانونی انتظام۔ اور امور مذہبی کی اصلاح کے لئے مشہور ہے۔

۵۴ (Charlemagne) یا چارلس اعظم ۷۴۲ء میں قوم فرانک کے بادشاہ کے گھر پیدا ہوا۔ ۷۶۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ۸۰۰ء میں شہنشاہ اہل روما ہوا۔ اور ۸۱۴ء میں ۴۶ سال کی کامیاب اور شاندار حکومت کے بعد مر گیا۔ یہ بادشاہ اپنی فتوحات اور شجاعت کے لئے زبان زد آفاق ہے۔ اور یورپ کے قرون اولےٰ کے اکثر افسانے اسی کے متعلق ہیں۔ اسی نے اپنی قوم کو تمام اقوام جرمن میں سب سے زیادہ طاقتور بنادیا۔ اور گویا یہی تمام مخالفین یونان اور حملہ آوران اسلام کے مقابلے میں پاپاؤں کی سپر بنا رہا۔ اس نے صرف عام فتوحات ہی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے تمام مقبوضات کا انتظام بھی نہایت عمدہ طور پر کیا۔ یہ بادشاہ ہارون رشید کا ہمعصر تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں باہم مراسلت بھی ہوئی۔

۵۵ ہارون رشید (۷۶۳ و ۸۰۸) خاندان عباسیہ کا پانچواں اور سب سے زیادہ مشہور خلیفہ۔ جو اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے تمام شاہان اسلام اور اپنے معاصرین سلاطین عالم میں بے نظیر تھا۔ اور جس کے نام کو تاریخی شہرت کے علاوہ الف لیلہ کے افسانوں نے بھی زبان زد خلائق بنادیا ہے +

۵۶ مامون الرشید خاندان عباسیہ کا ساتواں خلیفہ جو ہارون رشید کا دوسرا بیٹا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائی امین الرشید کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت ہی علم دوست۔ اور فاضل بادشاہ گزرا ہے۔ اور اس کے زمانے میں اسلامی سلطنت اپنی انتہائے وسعت پر پہنچکر اسکے مرتے ہی روبہ زوال ہوگئی۔ اور خاندان عباسیہ ضعیف ہونے لگا +

۵۷ (Elizabeth) ملکۂ انگلستان۔ جس کے زمانے میں انگریزی بحری طاقت کا عروج ہوا۔ اور سلطنت برطانیہ یورپ کی بڑی سلطنتوں میں شمار ہونے لگی۔ اس کے زمانے میں انگریزی علوم و فنون میں بھی بہت ترقی ہوئی اور مذہبی اصلاحیں بھی بہت ہوئیں۔ یہ ہندوستان کے بادشاہ اکبر کی ہم عصر تھی +

کسی ایسے موروثی خیال سے اپنی جگہ ہزار ہا سال کے واسطے کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہیں۔ اور وہ خیال ان کے دل و دماغ میں اسی طرح جم جاتا ہے۔ جیسے ان کے خیموں کی میخیں۔ یا ان کے مکانوں کی بنیادیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔

یہ واقعات اور بیانات ابتدائی قوموں کی پراگندگی کی سست روی کو اچھی طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کس قدر آہستگی سے ایک وادی سے دوسری وادی تک۔ ایک دریا سے دوسرے دریا تک۔ ایک جنگل سے دوسرے جنگل تک۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک۔ اور ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پھیلے ہونگے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پراگندگی اور اس افتراق کی ابتدا سے انتہا تک کتنا بے انتہا زمانہ اور کتنا بے قیاس وقت خرچ ہوا ہو گا۔ اور ان تمام باتوں سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ابتدائے ظہور انسان کے لئے کونسا زمانہ اور اس کی قدامت کے لئے کتنا عرصہ ٹھہرانا چاہیئے۔ اس مسئلے کا ہر ایک پہلو یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔

شاید انسانی خصوصیات میں سب سے زیادہ عجیب نطق ہے۔ گفتگو انسان کے لئے خاص ہے۔ اور علم اللسان علم کی حیثیت سے علم تشریح انسان کا ایک جزو ہے۔ اور نطق کے مسئلے پر بحث کرتا ہے۔ یہاں ہم یہ نہیں چاہتے کہ تاریخ اللسان کی بحث چھیڑیں۔ یا زبانوں کے اختلاف اور ان کے باہمی تعلق اور ربط پر غور کریں۔ بلکہ صرف ان نتائج کی تائید چاہتے ہیں۔ جو ہم نے اور علوم سے اخذ کئے ہیں۔ دنیا میں آدمیوں کے قبیلے قبیلے کی زبان جدا ہے۔ جو قبیلے ایک ہی قوم کے اجزا ہیں اُن کی زبان بھی ایک ہی ہے۔ ہاں صرف لہجے اور محاورے کا فرق ہے۔ اسی فرق کی وضاحت اور ترقی سے انکی زبان اوروں سے الگ ہو جاتی ہے لیکن اس وضاحت اور ترقی کی تکمیل کے لئے ایک نہایت لازمی چیز وقت ہے۔ محض ایک لفظ کے تلفظ کی تبدیلی بھی ایک عرصے کا کام ہے۔ اور اس سے بڑی تبدیلیوں کے لئے تو مدتیں چاہئیں۔ زبان اظہار خیالات کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کے تغیر بھی انہی قوانین ترقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو انسانی دل و دماغ پر کارگر ہیں۔ تغیرات لفظی ایسے لوگوں میں جلد ہوتے ہیں۔ جو عقلاً تیز ہوں۔ مگر قواعد

Marfat.com

کی زنجیروں کے پابند نہ ہوں - اس کے برخلاف وحشیوں میں - یا ان لوگوں میں جو پرانی لکیر کے فقیر اور دماغی ترقی میں سست ہوں - زبان صدہا سال تک اپنے اصلی رنگ پر قائم رہتی ہے - نوع انسان زبان کے لحاظ سے نوعوں اور قبیلوں میں تقسیم کی گئی ہے - اور بعض زبانوں کے اختلاف نہایت گہرے اور انمٹ ہیں - مثلاً سمیا طیقی نسل کی زبانیں آریا لوگوں کی زبانوں سے اصول میں ہی مختلف اور الگ ہیں - اور تورانی زبانیں ان دونوں سے نرالی اور جُدا ہیں - سمیا طیقی زبانوں کے مادّے ہی آریائی زبانوں میں نامعلوم اور غیر مفہوم ہیں - علمائے علم الالسنہ کا قول ہے کہ ان دونوں نسلوں کی زبانوں میں دس سے زیادہ مشترک الفاظ نہیں ملتے - اور غالباً اس اشتراک کی وجہ بھی زبانوں کا باہمی تعلق اور ارتباط نہیں ہے - یہی اختلاف ان دونوں خاندانوں کے قواعد صرف و نحو میں پایا جاتا ہے - ہر ایک کے الفاظ کی ترتیب اور فقروں کی ساخت ہی جدا ہے - اور تفاوت اتنا ہے - گویا دونوں ایکدوسرے کے نقیض اور ضد ہیں - چنانچہ علمائے السنہ یورپ جب تک اپنے خیالات کا ڈھانچا اور اپنی معلومات کا ڈھنگ نہ بدل دیں تب تک ان کے لئے عربی یا عبرانی زبانوں کے اصول کو سمجھنا اور اس میں لیاقت پیدا کرنا محال ہے لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کا ماہر اگر بفرض ہسپانی زبان سیکھنے لگے تو اس کو ان زبانوں میں اتنی مشابہت اور مشارکت معلوم ہو گی - جیسے کوئی سیاح ایک ہی شہر میں ذرا اور راستے سے جائے - لیکن عربی یا عبرانی کا تو ملک ہی جدا ہے +

یہاں اس ذکر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ناظرین پر یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ ان انسانی زبانوں کے بنیادی اور اصولی تغیرات میں کتنا وقت لگا ہو گا - اس کا جواب صرف قیاس پر ہی منحصر ہے - یہ سوال بھی بالکل ایسا ہی ہے - جیسے انسانی قوموں کی پراگندگی کا مسئلہ - اس میں شک نہیں کہ زبانوں میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے - اگرچہ ابھی تک علم الالسنہ کے علما اتحاد الالسنہ کے مسئلے پر مختلف الآرا ہیں +

سریانی اور جرمنی کو ہم اصل ثابت کرنا کچھ بھی نہ ہو تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی جرمن کو آسٹریلیا کے وحشی کا ہم نسل ثابت کرنا۔ فی الحقیقت ہم صرف اتنا کہنے کے مجاز ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ علم الاقوام اور علم الالسنہ کی اب تک کی تحقیقات انسان کے متحد الاصل ہونے پر ہی زیادہ زور دیتی ہے۔

تاریخی زمانے سے پہلے ہی یہ تمام زبانیں مکمل ہو چکی تھیں۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اختلاف آج کل کے اختلاف سے بھی بڑھا ہؤا تھا۔ زبانوں کی گردانیں اور ان کے صیغے پوری طرح قائم ہو گئے تھے۔ سنسکرت اور یونانی اپنے اپنے میلان کی انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ بحیرۂ رُوم کے کنارے پر سمیاطیقی زبانیں اپنے ثلاثی مادوں میں پابند ہو چکی تھیں۔ غرض یہ سب بانیں اب سے ۵-۶ ہزار سال پہلے بھی ایسی ہی مکمل اور مستقل تھیں۔ جیسے آج۔ اور ان کے باہمی اختلاف اور افتراق اس سے مدتوں پہلے واقع ہو چکے تھے۔ کچھ شک نہیں یہ مدّت بہت بڑی ہو گی۔ واقعات ہم کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ زمانہ جس میں مثلاً عبرانی اور یونانی زبانیں الگ ہوئیں۔ اس تنگ وقت اور مختصر مدت سے کئی گُنا زیادہ تھا۔ جو گزشتہ دنوں میں قدامت انسان کے لئے نہ صرف خیال کیا جاتا تھا۔ بلکہ یقینی اور صحیح سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر اس سے بھی آگے چل کر ہم کو السنۂ مشرقی کا اتحاد دیکھنا ہے۔ اس میں بڑے بڑے ناپیدا کنار صحرا اور اونچے اونچے دشوار گزار پہاڑ ہمارے سدِّ راہ ہیں۔ ان سب کو طے کرنے کے بعد پھر مغلیہ زبانوں کو مغربی ایشیا اور یورپ کی زبانوں سے ملانا ہے۔ غرض یہاں بھی وہی صورت ہے۔ جو تمام انسانی قوموں کی یگانگی کے وقت پیش آئی تھی۔ اور اس کے لئے بھی اتنا ہی وقت چاہیئے جتنا اُس کے واسطے ضروری تھا۔

باب ششم

نوع انسان کی عمر کی بابت تاریخ وقصص کی رائے

اس طرح مختلف علوم وفنون کی پیچ در پیچ تحقیقات پر نظر ڈالتے ہوئے ہم تاریخ (تذکروں) اور قصص کی حد تک پہنچتے ہیں۔ اگر ان میں سے پہلی مکمل یا دوسرے معتبر ہوتے تو ہم زیادہ اطمینان سے ان مسئلوں پر بحث کر سکتے تھے۔ مگر ہم مجبور ہیں کہ انہی نامکمل تاریخ اور جھوٹے سچے قصے کہانیوں کی دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہوتے ہوئے راستی کی منزل مقصود کا سراغ لگائیں اور حتے المقدور ابتدائے ظہور انسان کا ٹھیک وقت اور زمانہ معلوم کریں۔ تاریخ صحیح تو اس معاملے میں بالکل ساکت ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ واقع میں اگر مورخ اور علموں سے مدد لئے بغیر تاریخی زمانے سے پہلے کے حالات لکھنا چاہے۔ تو وہ خود اپنے منہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور خود لفظی تناقض اس کی حماقت اور بطالت تمام دنیا کے سامنے کھول دیتا ہے۔ تاریخ اس عقل و فہم کا نتیجہ ہے۔ جو انسان ابتدائی حالت کو چھوڑنے کے بعد ترقی کے ایک خاص درجے پر پہنچکر حاصل کرتا ہے۔ پس ایسے علم سے اس دور کے ابتدائی زمانے کا کیا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ جو گویا نوع انسان کا بچپن تھا۔ اور بے خبری کے پردے میں چھپا ہؤا تھا۔ اور جس کے ختم ہو جانے کے مدتوں بعد تاریخ کا آغاز ہؤا +

پہلے باب میں ہم نے تاریخ کی جامع اور مانع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ نویسی میں ہمیشہ دو مختلف اور علیحدہ علیحدہ پہلو رہے ہیں۔ ایک پرانی طرز ہے۔ ایک نئی۔ پرانی طرز کی تاریخ حالات کا ایک لفظی مرقع

ہوتی تھی۔ نئی طرز کی تاریخ واقعات کی ایک سادہ تفصیل ہوتی ہے۔ پرانی تاریخ میں صرف انسان اور اُن کے کارناموں کی داستان ہوتی تھی۔ نئی تاریخ انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر غور کرتی ہے۔ اور افعال انسانی کو دیکھ کر واقعات۔ ان کے اسباب۔ ان کے نتائج۔ اور تہذیب و تمدن کے اُن معرکتہ الآرا انقلابات پر بحث کرتی ہے۔ جن کا ذرا سا بیرونی اشارہ اُن واقعات سے ملا تھا۔ طرز قدیم کی تاریخوں میں یہ بات نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کہ طرز بیان سنجیدہ۔ اور عبارت پسندیدہ ہو۔ اور انسانی افعال و اقوال حیرت خیز ہوں یا عبرت انگیز۔ ان میں واقعات کی صحت اور حالات کی صداقت کی نسبت تکمیل داستان کا زیادہ خیال ہوتا تھا۔ نئی طرز میں الفاظ اور فقرات خواہ کیسے ہی ہوں۔ اصلی کوشش یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے۔ وہ مطابق واقع اور سچ ہو۔ اور ان اسباب و نتائج پر جان توڑ کوشش کی جائے۔ جن کے مجموعے سے وہ عالیشان اور اہم چیز بنتی ہے۔ جسے نوع انسان کہتے ہیں۔ یہ کہنا کیا ضرور ہے کہ یہ طرز حال ہی کی ایجاد ہے۔ اور اس طرز کی اہمیت اور اس کے نتائج کی واقفیت ضرور ہے کہ پرانی تمام تاریخوں کو ان کے درجے سے گرا کر صرف تاریخ نویسی کا سامان اور اسباب قرار دیئے۔

لیکن یہ تاریخ ہمارے موجودہ مسائل کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ اس لئے ہم کو جو کچھ اسباب بھی ملیں۔ انہیں کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اور پرانے زمانے کے تذکرے تو مفید ہونے ہی چاہئیں۔ کیونکہ وہ اس ابتدائی زمانے سے ہماری نسبت زیادہ قریب تھے۔ اس لئے آغاز تہذیب اور نوع انسانی کے ہوش سنبھالنے کی ابتدائی کیفیت سے زیادہ واقف و آگاہ ہونگے۔ کم از کم یہ تذکرے اتنا تو ضرور بتاتے ہیں کہ قدیم زمانے کے سب سے زیادہ عقلمند اور سمجھدار آدمی اس ابتدائی حالت کی بابت کیا جانتے تھے۔ کیا مانتے تھے۔ اور کیا سمجھتے تھے۔ وہ ہم کو بحیرۂ روم کے آس پاس کی ترقی یافتہ قوموں کے تمدن اور معاشرت کے بھی بہت سے پہلو دکھاتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر اُن کے راویوں کے ذہن میں نہ تھا۔ بعض جگہ یہ کوشش بھی کی گئی ہے

کہ ابتدائے انسان کے متعلق پُرانی کہانیوں کو تاریخی لباس میں دکھا کر اپنے ہمعصروں کے بہلانے کے لئے اس اہم مسئلے کا جواب مہیا کریں۔ مضمون نگاری کی یہ قسم جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ اہل یونان نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ایجاد کی تھی۔ اس زمانے کے بڑے مصنف ہیروڈوٹس۔ تھیوسی ڈائڈیز۔ اور زینوفن ہیں۔ ان کے بعد اور بہت سے آئے۔ مگر سب اپنے قابل عزت بزرگوں سے گھٹے ہوئے۔ جب روما الکبرےٰ کا عروج ہوا۔ اور یونان صوبہ بن گیا۔ تو ٹائبر کا کنارہ علوم و فنون کا ملجاو ماوا ہو گیا۔ لیکن ان کی علمی ترقی اپنے یونانی استادوں کے کام سے لگاّ نہ کھا سکی۔ اور اگرچہ یونان دنیاوی طاقت کے لحاظ سے روما کا خادم بن گیا۔ مگر دماغی ترقی میں ان کا مخدوم ہی رہا۔ اس سرچشمے سے بعد میں وہ تمام نہریں نکلیں جنہوں نے تمام مغربی یورپ اور آگے چل کر نئی دنیا کو سرسبز اور شاداب کیا۔ ہاں اب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایک حد تک ان قدیم نمونوں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ محققانہ طرز تحریر کی بنیاد ڈالی گئی ہے +

ممکن ہے کہ چینی اور ہندی کتب قدیم کی تفتیش ہمارے لئے یونان سے زیادہ پرانی تاریخیں مہیا کر دے۔ ابھی اس طرف تحقیق کا میدان مشرقی زبانوں کے عالموں اور محققوں کے سامنے کھلا پڑا ہے۔ لیکن کتب مقدس کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ غالباً ان میں سے کوئی بھی تاریخ کے نکتۂ خیال سے نہیں لکھی گئی۔ اور ان میں جو کچھ تاریخی حال ہے بھی وہ اور باتوں میں ملا ہوا۔ اور قصوں کی صورت لئے ہوئے ہے۔ جو تذکرے اور واقعے آج ہم کو ہندی۔ شامی۔ مصر۔ اور بالخصوص عبرانی کتب قدیمہ میں ملتے ہیں۔ وہ سچ واقعات کے قلمبند کرنے اور صحیح حالات کی یادداشت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے۔ بلکہ ان کا مدعا یہ تھا۔ کہ اس خاص قوم کے مذہبی اور تمدّنی حالات کے اظہار اور قیام کے لئے ایک سانچہ ہوں۔ بہرحال ہم ابتدائی حالات معلوم کرنے کے لئے ان کو ہی غنیمت سمجھتے ہیں +

Marfat.com

اس قسم کی سب سے زیادہ پرانی کتابیں جو آریا نسل کے پاس ہیں وہ برہمنوں کی پرانی مقدس کتابیں ہیں جن کو وید کہتے ہیں۔ یہ کتابیں بھی عبرانی انجیل کی طرح بہت سے حصوں میں منقسم ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے۔ اور یوں کل کتاب کی تصنیف بہت بڑے عرصے میں مکمل ہوئی۔ ان میں سے سب سے زیادہ پرانا حصہ غالباً اکیسویں اور انیسویں صدی قبل مسیح میں لکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس کتاب کو منشا کے لحاظ سے ہرگز تاریخی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ مگر پھر بھی اس کے اندر بہت کچھ تاریخی مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ پرانی ہے۔ جس سے اب سے ۴ ہزار برس پہلے کے آریا لوگوں کے تمدنی حالات کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے +

حمیا طیقی نسلوں میں اس سے بھی پہلے کی تحریریں پائی جاتی ہیں جب یورپ کے مورخوں کا ابو الآبا ہیروڈوٹس مصر میں گیا۔ تو وہاں کی علمی اور تاریخی قدامت نے اس پر وہی اثر کیا جو آج کل کا کوئی محقق یونان کی سب سے زیادہ قدیم دستی تحریر کو دیکھ کر محسوس کرے۔ فی الحقیقت ہمارے پاس سب سے پہلی تاریخی شہادتیں مصر قدیم کی تحریرات ہیں۔ خواہ وہ سنگین چٹانوں پر ہوں یا محلوں اور مقبروں کی دیواروں میں۔ یا کاغذ نما جھلیوں پر ہوں۔ یا درختوں کی چھالوں پر۔ ہاں اگر آئندہ تحقیق سے چین کی تحریرات میں کوئی چیز اور بھی زیادہ پرانی ہاتھ آجائے تو بات اور ہے +

عبرانی کتب مقدسہ کی تحریر کا ٹھیک وقت ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ لیکن وہ اگر ہومر کی تصنیفوں سے مقدم نہ ہوں تو ہیروڈوٹس کی کتابوں سے تو یقینی پہلے کی ہیں۔ غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں بنی اسرائیل کے نبیوں اور پیغمبروں نے اپنے زبانی مقولوں کو کتابی صورت میں مرتب کرنا شروع کیا۔ مگر عبرانیوں اور سمیاطیقی قوموں میں فن تحریر اس زمانے سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں حضرت یوشع کے عہد سلطنت میں ایک قانون کی کتاب دستیاب ہوئی تھی۔ جو غالباً

Marfat.com

قانون دوم اور کچھ اور پرانی تجربات کے اجزا تھے۔ اور انہی کو بادشاہ اور علمائے مذہب نے اصلاح قوم کیلئے استعمال کیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی اکثر کتابوں نے موجودہ صورت یہودیوں کے بابل میں قید ہونے کے بعد اختیار کی ہے ؛

مذکورہ بالا تمام تاریخی ۔ نیم تاریخی ۔ شاعرانہ ۔ اور پیغمبرانہ کتابوں کے پرے افسانہ و قصص کی سرحد واقع ہے یہ بات یقینی ہے کہ انسان نے سوچنا اور بولنا لکھنے سے بہت پہلے شروع کیا ۔ ایک زمانہ تھا جبکہ اس وقت کے زیادہ شائستہ اور ذہین لوگوں کے تصور ہر قسم کے قصّے گھڑنے میں مشاق تھے۔ ابتدائی آدمیوں کے عقیدے ۔ امیدیں ۔ آرزوئیں تمنائیں مقصد ۔ مدعا ۔ غایت ۔ غرض ۔ خواب اور خیال غرض سب کچھ مل کر اپنا زور زبانی داستانوں میں خرچ کرتے تھے۔ ایک نسل کی کہانیاں اور گیت دوسری نسل کو ورثے میں ملتے تھے ۔ کبھی اسی صورت میں اور کبھی بہت کچھ مسخ ہو کر ؛

تاریخ اور قصص کا فرق ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ۔ اور اب پھر ناظرین کے ذہن نشین کرنے کے لئے دُہراتے ہیں ۔ تاریخی مضامین کا مدار واقعات مذکورہ کی ہمعصر شہادتوں پر ہے ۔ خواہ واقعات کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہوں قصوں کا انحصار ان پر ہے جن کے راوی ان قصوں کے مشتملہ واقعات کے وقوع کے وقت اور جگہ سے دور ہوں ۔ تاریخ صرف ان لوگوں کے کتابے اور کتابیں معتبر سمجھتی ہے ۔ جنہوں نے اس واقعے کو آنکھوں سے دیکھا ہو ۔ اور اس بات کو کانوں سے سنا ہو ۔ قصے ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہیں ۔ جو مدتوں تک صرف زبانوں پر رہ کر لکھے گئے ہیں ۔ اور جن کی صداقت صدیوں تک صرف قوت حافظہ اور طاقت نطق پر مبنی رہی ہے ؛

صحت واقعات کے لحاظ سے تاریخ کی خوبی دو باتوں پر منحصر ہے ۔ اوّل بہتر تو یہ ہے کہ محررہ وقائع چشم دید حالات کو ان کے اثنائے وقوع میں قلمبند کرے ۔ جیسے جولیس سیزر کی تشریحات ۔ جن میں کسی قصّے کا دخل

Marfat.com

ہے نہ کسی پرانی دستاویز کا اثر۔ بلکہ جنگ فرانس ہیں جو کچھ مصنف روزمرہ دیکھتا اور معلوم کرتا تھا۔ وہی لکھ دیتا تھا۔ یا جیسے تزک تیموری اور تزک بابری وغیرہ۔ جن سے ہمارے ناظرین زیادہ آشنا ہیں۔ اس قسم کی تحریرات باقی تمام تاریخی کتابوں پر فضیلت اور سبقت رکھتی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ گو خود مصنّف نے واقعات کو نہ دیکھا ہو۔ مگر اس کی تحریروں کا مدار صرف انہی کتابوں پر ہو جو وقوع واقعہ کے وقت لکھی گئی ہوں۔ اور جن کے لکھنے والوں نے اپنے چشم دید حالات لکھے ہوں*

اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصلی سوالات کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ علم اس کی بابت کیا کچھ کہتے ہیں۔ تاریخ تو طبعاً خاموش ہی ہے۔ کسی آدمی نے انسان کو دنیا میں آتے ہوئے نہیں دیکھا ابتدائی آدمی نے خود اپنے حالات کسی کاغذ یا پتھر پر نقش نہیں کئے۔ کوئی یادگار بھی ایسی نہیں ملتی۔ جس سے ابتدائے ظہور انسان کا پتہ چلے۔ اس لئے کسی کی کوشش اس زمانے کی تاریخ لکھنے میں مفید اور بارآور نہیں ہو سکتی۔ اور قیاس صحیح کا بھی یہی مقتضا تھا۔ کوئی شخص اپنی پیدائش کا حال نہیں جانتا۔ کوئی بچہ اپنے دنیا میں آنے کے حالات آیندہ لوگوں کی اطلاع اور دلچسپی کے لئے قلمبند نہیں کرتا جاتا۔ یہ خیال۔ خیال محال ہے۔ بے خبر آدمی اپنی بے خبری کا حال کیا کہیگا۔ ؎

از بے خبری کس چہ خبر باز دہد

ابتدائی آدمی فن تحریر سے ناواقف۔ تاریخی شہرت سے ناآشنا۔ اپنی ضروریات زندگی کی گردآوری میں سرگرداں۔ اپنی جان آفات ارضی و سماوی سے بچانے میں پریشان۔ کیونکر اپنا حال لکھتا۔ اور کس طرح اپنی ابتدائی کیفیت ہم کو بتاتا*

اس لئے تاریخ صحیح سے تو چنداں فائدے کی امید نہ رکھنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی دونوں صورتیں یہاں بیکار اور لاچار ہیں۔ ہمارے حضرت آدمؑ کو ہماری دلچسپی کے لئے تاریخیں لکھنے اور مینارے کھڑے

کرنے کے علاوہ اور ہی بہت کام تھے۔ اس لئے اس تلاش محال میں پڑیں ہی کیوں۔ کوئی آثار قدیمہ کا متلاشی ایسے قدیمی آثار کو تلاش ہی کیوں کرے جو اگر مل جائیں تو خود اس بات کا بہترین ثبوت ہوں کہ وہ قدیمی آثار نہیں ہیں۔ کوئی عالم محقق ایسی ابتدائی یادگار کے پانے کی امید کیوں کرے۔ جس کا وجود خود ہی اس بات کی سب سے اچھی دلیل ہو کہ وہ ابتدائی یادگار نہیں ہے +

لیکن گو ہر قسم کی تاریخی کتابیں براہ راست ہمارے سوال کے جواب دینے سے قاصر ہیں۔ مگر بالواسطہ ان سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ اس قسم کی تحریروں کا اتنے دور دراز حصوں اور ایسی مختلف حالتوں میں رہنے والے لوگوں میں اتنا قدیم وجود خود ہی ایک نتیجہ خیز امر ہے۔ یہ مسلم ہے کہ اس قسم کی تحریرات چینیوں میں حضرت عیسےٰ سے ۱۵ سو برس پہلے۔ آریاؤں میں ۲ ہزار برس پہلے۔ اور وادی فرات کے رہنے والوں میں ۲۱ سو برس پہلے موجود تھیں۔ اور مصر کی یادگاریں اب تک کھڑی کہہ رہی ہیں کہ ہمارے بنانے والے حضرت عیسےٰ سے ڈھائی ہزار برس پہلے فن تحریر اور انشا پردازی میں یگانۂ آفاق اور استاد زمانہ تھے۔ بنی اسرائیل کے شاعروں اور نبیوں نے بھی ۸ سو برس پہلے اپنی باتوں کو شاعرانہ اور نیم تاریخانہ رنگ دیا تھا۔ اور یونانیوں میں ۵ سو برس پہلے ہیروڈوٹس نے فن تاریخ نویسی کی ابتدا کی۔ اور اس کے بعد تھیوسی ڈاڈیز نے اس کو مکمل کیا۔ جو حسن ادا اور طرز بیان کے لحاظ سے اب تک بھی بے نظیر ہے +

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہایت ہی دور دراز کے ملکوں میں قومیت کے لحاظ سے بالکل الگ الگ لوگوں میں اور زبان کی حیثیت سے سرتاپا مختلف زبانوں میں ڈھائی ہزار سے ساڑھے چار ہزار برس تک کی پرانی تاریخی تحریرات پائی جاتی ہیں۔ یہ امر خود ہی قدامت انسانی کی ایک زبردست دلیل ہے۔ فن تحریر انسانی ترقی کا ایک اعلےٰ درجہ ہے۔ اور پھر اس فن کی ایجاد کے بعد بھی قوائے دماغی کو ابتدائی انشا پردازی اور معمولی وقائع نگاری کے قابل بنانا بھی ایک عرصے کا کام ہے۔ فلسفیانہ تاریخ لکھنے کا تو کیا ذکر۔

Marfat.com

اس کے بعد پھر ایک زمانہ چاہیئے۔ کہ یہ لیاقت اتنے مختلف آدمی ایسے دور دراز کے ملکوں میں حاصل کر سکیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ چین میں یہ فن ہومر اور داؤدؑ کے زمانے سے پہلے رائج تھا۔ اگر یہ سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے وادی اٹک کے رشیوں نے تاریخ لکھنا اور شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگر یہ سچ ہے (جیسا کہ فی الواقع ہے) کہ قوم یونان نے چھٹی صدی قبل مسیح میں اتنی دماغی ترقی کر لی تھی جس کا قابل تعریف نمونہ ہیروڈوٹس کی تاریخ ہے۔ اگر ان سب سے بڑھ کر یہ سچ ہے کہ صدیوں پہلے وادی نیل میں اہرام مصری کے بنانے والے اپنی مقدس تاریخ اور فلسفہ لکھنے میں مشغول تھے۔ تو اندازہ کر لینا چاہیئے کہ ایسی نمایاں اور عالیشان ترقی کے لئے کتنی مدتوں اور کتنے برسوں کی ضرورت ہوئی ہوگی +

اس کے آگے ہم قصّوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جس سوال کے جواب میں صحیح تاریخ ساکت ہے۔ اس کے لئے قصوں نے بیسیوں جواب تیار کر رکھے ہیں۔ ہر قوم اور ہر قبیلے نے ابتداے انسان کی بابت ایک ایک قصّہ بنا رکھا ہے۔ جو نسلاً بعد نسلٍ مسلّم ہوتا چلا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہ قصے قومی مذہب کا ایک جزو بن گئے اور بعد میں تمام مسائل حکمت و فلسفہ پر ان کا اثر پڑا۔ ابتدائی شاعرانہ خیال تاریخی لباس پہن کر صحیح تاریخ ہونے کا مدعی ہو گیا۔ اور ایسا جما کہ اس کا نکالنا دشوار ہؤا۔ ابتدائی آدمیوں کا جواب عقلمند آدمیوں کے گرد ایک تاریک حلقہ ہو گیا۔ اور نوع کے بچپن کی بھولی بسری کہانیاں اور مٹی مٹی نشانیاں جوانی کی عقل و تمیز کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بن گئیں +

ان قصّوں کی صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن عموماً ایک دو باتیں لازمی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک اکثر خود اس قوم کی قدامت کا دعوے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قدامت مایۂ فخر و ناز تھی۔ چنانچہ مصری اپنے آپ کو چاند سے بھی پہلے کا کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ معمولی صدیاں اور قرن بالکل ہیچ تھے۔ ہر قوم اس بات کی مدعی تھی کہ وہی اس ملک کے سب سے پرانے اور قدیم باشندے ہیں۔ پرانے سے

پُرانے زمانے کے وحشی سے وحشی لوگ بھی یہ جانتے تھے کہ قدامت کا دعوےٰ اگر ثابت ہو جائے تو استحقاق اور فضیلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے لوگ اپنے انتقال مکان کا ذکر بھلا کر اسے چھپانے لگے۔ اور قدیم رہائش پر زور دینے لگے +

اگرچہ ہم کو پورا یقین ہے کہ روے زمین انسانی افتراق اور پراگندگی سے آباد ہوئی ہے۔ مگر سب کی سب پُرانی قومیں اس سے انکاری ہیں۔ اور یہی کہتی ہیں کہ ہم ہمیشہ سے اپنے ہی مُلک میں رہتے آئے ہیں۔ اور یہیں کے رہنے والے ہیں +

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے لوگوں میں ان ملکوں کے اصلی باشندے ہونے کا خیال کیونکر پھیل گیا۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر ایک قصے میں ابتداے آفرینش انسان کو زمین سے تعلق دیا ہے۔ پُرانے لوگوں کو یہ خیال بہت پسند تھا کہ وہ مٹی سے بنے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ ان کی پیدا کرنے والی طاقت نے ان کی ساخت میں مٹی کو بھی لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم اس لاجواب دلیل سے اس ملک میں اپنی قدامت اور اپنا قدرتی حق ثابت کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ ایسا حق نقل مکان کرنی والی زیادہ جنگجو قوموں کے مقابلے میں خوب کام آتا ہوگا۔ اس کے علاوہ درخت بھی زمین سے اُگتے ہیں۔ اور شاید ابتدائی آدمیوں کی قواے ظاہری اور باطنی پر سب سے زیادہ گہرا اثر نباتات کی نشوونما نے کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ طبعاً ان کو یہ خیال آیا ہو۔ کہ ہم بھی ان پودوں کی طرح ہی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن بہرحال قصے ہمیشہ اور اور صورتیں ہی لیتے رہے۔ پُرانے آدمیوں میں دو قسم کے خیالات تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ترقی پاکر پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ دونوں خیال غلط ملط ہو گئے۔ انسان بنا تو مٹی سے ہے۔ مگر بنانے والا ایک قادر ذوالجلال ہے۔ یونانیوں میں ایک روایت یہ تھی کہ آدمی پرومتھیوش کے ہاتھ کا بنایا ہوا مٹی کا کھلونا تھا۔ اور اسی کی سزا میں حاسد دیوی دیوتاؤں نے اسے کوہ قاف کی چوٹی پر زنجیروں میں جکڑ کر قید کر دیا۔ مگر زیادہ مشہور یہ عقیدہ تھا۔

Marfat.com

کہ دو دیوتا ڈیوسیلین اور اس کی بیوی پرّہ ایک سیلاب سے جان بچا کر کوہ انفرس پر پہنچے۔ وہاں زیوس نے حکم دیا کہ اپنی ماں کی ہڈیاں نیچے پھینکدیں۔ ان ہڈیوں سے پتھّر مراد ہیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ان کو پھینکدیا۔ اور معاً زن و مرد پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی روایت یوں ہے۔ کہ خالق کردگار پرجاپتی بہت سے امتحانی تجربوں کے بعد ایک ایسی نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہوُا۔ جو اپنے آس پاس کے اسباب کے مطابق تھی اور اس لئے زندہ رہ سکی۔ لیکن ہندوستان میں خلقت انسان کا مسئلہ بہت کچھ ادل بدل ہوُا ہے۔ چنانچہ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ بجائے مٹی سے بننے کے انسان ادنےٰ جانوروں سے ترقّی پا کر پیدا ہوُا ہے۔ یونان والوں نے اور ان سے پہلے لیبیا اور مصر والوں نے ایک خاص دلدل کو انسانی خلقت کی ابتدائی جگہ ٹھہرایا تھا۔

یہاں ہم تمام قصّوں کو دُہرانا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان کی ضروری اور نمایاں خصوصیات کو بیان کر کے ان سے قدامت انسان کے متعلق کچھ نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ خیالات انسانی قوائے دماغی کے بچپن کے ہیں۔ یہ افسانوں کا زمانہ فرد کی زندگی میں طفلی کی حالت کے مانند ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ ایک جگہ نوع کی طفولیت ہے۔ دوسری جگہ فرد کی۔ مگر دونوں صورتیں ہیں وہی۔ جن میں حواس ظاہری اور قوت تصور عقل اور سوچنے کی طاقت پر غالب اور رہوتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ افسانے بنائے گئے۔ تب تک نوع کے دل میں کیوں کا سوال نہیں گدگدایا تھا۔ ان کو وجہ آفرینش کا خیال نہ آیا تھا۔ نہ انہوں نے ان مشکلوں اور دقّتوں کا لحاظ کیا تھا۔ جو ان کے افسانوں کے ماننے میں عقل صحیح کو پیش آتی ہیں۔ مثلاً یونانیوں سے یہ پوچھنا بالکل بجا ہے۔ کہ وہ مٹی کی صورتیں جن میں پرامتھیوس کے چھونے سے جان پڑ گئی اپنی اس پیدائش کی وضع سے کیونکر آگاہ ہوئیں۔ یا ڈیوسیلین کے سنگی آدمیوں کو کیونکر معلوم ہوُا کہ وہ فلاں وقت پتھّروں کے پھینکنے سے پیدا ہو گئے۔ لیکن یہ نہایت ہی معمولی

Marfat.com

اور معقول سوال تاریخی زمانے کے عقلمند سے عقلمند یونانی کے دل میں بھی پیدا نہیں ہوئے۔ یہ تمام باتیں بالکل بچپن کی طبیعت سے مشابہ ہیں۔ بچہ کبھی کسی قصے کی ناممکنات پر بحث نہیں کرتا۔ عقل کے اس درجے میں جس قدر خلافِ عقل کوئی بات ہو۔ اسی قدر زیادہ قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہوتی ہے۔ بچپن کی یہ کہانیاں حافظے میں محفوظ ہو کر آئندہ زندگی کے تمام خیالات اور اعتقادات پر اثر ڈالتی ہیں۔ یہی حال ان ابتدائی قصّوں کا بھی ہے۔ جو گویا نوع کے بچپن کے زمانہ میں کہے گئے تھے۔ اور اس طرح جوانی تک میں اپنا رنگ دکھاتے رہے ۔

یہاں ان قصّوں کا اشارہ صرف اتنا ہے کہ انسانی ابتدا کو بہت بڑی مدت ہوئی۔ اس سے زیادہ کے لئے تمام ایسے قصّے محض بیکار اور لایعنی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ قصے جغرافی اور تاریخی کیفیتوں سے بالکل پہلو بچا جاتے ہیں۔ ان کو وقت اور جگہ کی صحیح تحقیق سے بحث نہیں ہوتی ۔ کیونکہ ان کے لئے تحقیق۔ پرمحنت **مطالعہ** سیاحت۔ معلومات ریاضی اور اور بہت سی باتوں کی ضرورت ہے۔ جن کا وجود نوع انسانی کے بچپن میں محال تھا۔ دل جو کچھ خواب وخیال اور تصوّر و تخیل سے وضع کر سکتا تھا۔ وہ پیدا ہو گیا۔ لیکن صحیح تاریخ کے لئے بہت محنت اور جفاکشی کی حاجت ہے۔ جو نوع کی اس حالت میں ممکن نہ تھی ۔

غرض ہمارا اہم نتیجہ ہم کو خود ان قصوں کے نفس مطلب اور ان کے بچّوں کی سی باتوں سے نکالنا چاہیئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ تاریخ جو انسانی دل و دماغ کے عالم شباب کا نتیجہ ہے۔ اب سے کم و بیش ۴ ہزار برس پہلے ترقّی پا چکی تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ نوع انسانی کا بچپن جس میں اُس کو قصے اور کہانیاں بنا کر دل خوش کرنے کی حاجت تھی۔ اس سے بہت بہت پہلے ہوگا۔ اور اس "بہت بہت پہلے" کی تعین کے لئے اور علم ہماری مدد کے لئے تیار ہیں ۔

باب ہفتم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم السنین کی رائے

اب سب کے بعد ہم کو علم السنین کے دلچسپ نتائج دیکھنے ہیں۔ ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ یہ علم تاریخ کا ایک جزو ہے۔ ہر واقعے کا ایک وقت ہونا چاہیئے۔ کاروبار انسانی میں اگر وقت کے لحاظ سے تقدم وتاخر کی ترتیب نہ رہے تو ان کی کیفیت کا بیان محال ہو جائے۔ انسانی سوانح میں یہ رکن اتنا ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک علحدہ علم پیدا ہو گیا۔ جس کا کام وقت کی پیمائش اور تحقیق ہے۔ اس کو انگریزی میں کرونالوجی کہتے ہیں۔ اور ہم نے اس کا نام علم السنین رکھا ہے۔ اس کی ضرورت علمائے قدیم نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اگرچہ یہ اچھی طرح معلوم نہیں کہ مسائل ہیئت سے سالوں اور صدیوں کا شمار کرنے کی پہلی پہلی کوششیں کب ہوئیں۔ غالباً ہر قوم نے ہوش سنبھالتے ہی وقت کی پیمائش کے لئے تقویمیں بنانے کا خیال کیا ہوگا۔ زمین کی گردش اور اجرام فلکی کے مقام جن پر آج تک سال وماہ کا قیام ہے۔ ابتدائی لوگوں کے لئے بھی شمار ایام کا ذریعہ بنے ہونگے۔ شمار ایام کی ان امتحانی کوششوں میں عموماً ملک یا قوم کا کوئی مہتم بالشان واقعہ سنوں کی ابتدا کرتا تھا۔ مثلاً انتظام حکومت کا آغاز۔ کسی بڑے شہر کی بنا۔ کسی عالی ہمت بادشاہ کی تخت نشینی۔ کسی بڑی ہیبت بلا سے نجات۔ کسی عظیم الشان لڑائی میں فتح۔ غرض اس قسم کی کوئی بڑی بات ایک ابتدا ہوتی تھی۔ جس سے اور واقعات کا شمار کیا جائے۔ قدما میں یہ بات طبعی تھی کہ وہ ہر ایک واقعے کے وقت کو کسی گزشتہ معرکتہ الآرا واقعے کے

بُعد سے گنتے تھے۔

اس طرح علم السنین کے مختلف سن پیدا ہو گئے۔ تقریباً سب قوموں نے اپنے اپنے سن الگ الگ بنا رکھے تھے۔ خصوصاً وہ قومیں جو آٹھویں صدی قبل مسیح میں برسرِ عروج تھیں ایجاد سنین کی بڑی خواہشمند اور دلدادہ معلوم ہوتی ہیں۔ قدیمی عبرانیوں کے بزرگوں کے پاس ان کی پُرانی تاریخ میں کوئی سن نہ تھا۔ جس سے وہ اپنے قومی انقلابات کا شمار کرتے۔ اگرچہ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا اپنے ملک سے نکلنا۔ یا حضرت موسےٰؑ کا بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے چلنا شمارِ ایام کی ابتدا کے لئے بہت عمدہ قومی واقعے تھے۔

اہل بابل نے سنہ ۷۴۷ قبل مسیح میں اپنے پرشکوہ بادشاہ بنونسر کی سال تخت نشینی سے اپنی قومی سن کی ابتدا کی۔ جو اُن کی جنوبی سلطنت میں مدتوں تک رائج رہا۔ اس سے کچھ دن پہلے یعنی سنہ ۷۷۶ قبل مسیح میں یونانیوں نے اپنا اولمپی سن جاری کیا تھا۔ جس کی ابتدا کو وہ اولمپس کے تماشوں میں کوربیس کی نمایاں کامیابی تھی۔ ہر اولمپیڈ میں چار سال ہوتے تھے۔ یرو کے قول کے مطابق رومتہ الکبرے کی بنا سنہ ۷۵۳ قبل مسیح میں ڈالی گئی۔ اور اہل روما نے اسی سال سے اپنے سن کو شروع کیا۔ اس طرح ان ۲۹ برس کے اندر اندر کے تین عظیم الشان واقعات سے تین قوموں نے اپنے سن مقرر کر لئے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سن جاری بہت دنوں بعد ہوئے۔ یہ تینوں سن برابر رائج رہے۔ یہاں تک کہ آخرکار مسیحیوں نے سلطنت روما میں اتنا زور پکڑ لیا کہ انہوں نے بنائے روما کی جگہ ولادت مسیح کے سال سے اپنا نیا سن شروع کیا۔

ہندوستان میں ولادت مسیح سے ۵۷ برس پہلے یہاں کے مشہور مہاراجہ بکرماجیت کا سمت شروع ہوا جو اب تک ہندو اس ملک کے اکثر حصّوں میں استعمال کرتے ہیں۔

سنہ ۷۷ء میں راجہ سالباہن کا سن شروع ہوا۔ یہ بھی دکن میں کہیں کہیں

رائج ہے۔ بہرحال عیسائیوں کے غلبے کے ساتھ سن عیسوی کو بھی ترقی ہوئی۔ اور اس وقت تمام دنیا میں سب سے زیادہ رواج اسی سن کا ہے۔ سن مسیح کی ابتدا میں عیسائیوں کو یہ تکلیف تھی کہ پرانے بزرگوں کے تیہوار ان کو کافروں کے دنوں اور سالوں کے مطابق منانے ہوتے تھے۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنے سن کو ابتدائے آفرینش سے شمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت بنی اسرائیل اتنے عقلمند اور ذی علم ہو گئے تھے کہ کم ازکم برائے نام اپنے سن کی ابتدا ظہور آدم سے کرتے تھے۔ مسیحیوں نے بھی ان کی تقلید چاہی۔ مگر یہ آسان نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت توریت کے تین مختلف نسخے تھے۔ جو یکساں صحیح مانے جاتے تھے۔ ایک کلدانی زبان میں۔ ایک عبرانی میں۔ اور ایک یونانی میں۔ لیکن تعین وقت کے لحاظ سے یہ تینوں بالکل مختلف تھے۔ اور کوئی چوتھا نسخہ موجود نہ تھا کہ اس سے ملا کر ان تینوں کی تصحیح کی جاتی +

بہرحال ابتدائی عیسائیوں نے کسی نہ کسی طرح ابتدائے آفرینش کا ایک سن مقرر کر لیا۔ جو قرون وسطیٰ بلکہ زمانہ حال تک مستعمل رہا۔ اور اب بھی بہت سے مدعیان علم و خرد کی کوشش ہے کہ اسی سن سے تمام واقعات کو شمار کریں۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ جو ایسے سن کے متلاشی تھے۔ ان کے نزدیک آفرینش عالم اور خلقت آدم ایک ہی وقت میں واقع ہوئی۔ یہ بات ان کا دین و ایمان تھی۔ اور اسی پر ان کے تمام تقسیم اوقات کا دار و مدار۔ لیکن چونکہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس لئے توریت کے تینوں نسخوں کا اختلاف اعداد ایک دائمی سرمایہ فساد رہا۔ ڈیبوگنتولر نے لکھا ہے۔ کہ جو لوگ توریت اور انجیل سے ابتدائے آفرینش کا وقت قرار دیتے تھے انہوں نے دو سو سے زیادہ نتائج نکالے تھے۔ اور اگر کوئی محقق آج بھی چاہے کہ ان سے زیادہ اطمینان بخش اور صحیح نتیجہ نکالے تو یہ بات ممکن نہ ہوگی +

بہرحال ان نتائج میں ابتدائے آفرینش کے لئے قریب سے قریب

وقت ۳۴۸۳ قبل مسیح ہے۔ اور دُور سے دُور ۶۹۸۴ قبل مسیح۔ اس طرح پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں کے عالموں کی تعین اوقات میں ساڑھے تین ہزار برس تک کا فرق تھا۔ اگرچہ وہ سب سن ایک ہی استعمال کرتے تھے۔ جو انجیل سے ماخوذ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ اور نامعقول شمار سنین سے آج کل کیا کام چل سکتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح سترھویں صدی کے وسط میں اسقف اعظم جیمس اشر نے انہی اعداد سے ایک متفق علیہ سن مقدس نکالنے کا عزم کیا۔ اور نہایت ہی عجیب بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ مغربی قوموں کے اعلیٰ وادنےٰ سب لوگوں میں سو برس سے بھی زیادہ تک بالکل مسلّم اور مستند مانا گیا۔ حال ہی میں علمی تحقیقات اشری سن کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ مگر اب تک بھی یورپ اور امریکہ کے عوام الناس پر اس کا بے انتہا اثر ہے۔ کیونکہ یہ انجیل مقدس کی تعین اوقات سے ماخوذ ہونے کا مدعی ہے۔ خدا جانے کیونکر اور کس طرح وہ تاریخیں جو اشر نے تیار کی تھیں نئے اور پُرانے عہدنامے کے تمام مستند نسخوں کے حاشیوں پر لکھ دی گئیں۔ اور جب ایک دفعہ ان کو وہاں جگہ مل گئی تو پھر اس زمانے کے سیدھے سادے کم علم آدمیوں کے لئے ان کا نکالنا آسان نہ تھا۔ اس طرح اس سن کا رواج عالمگیر ہو گیا۔ تمام اٹھارویں اور نصف انیسویں صدی کے تمام مورخ ابتدائے عالم کے واقعات کو اسی سن سے شمار کرتے رہے انجیل کے تمام نسخوں کے حاشیے پر اب تک بھی وہی تاریخیں بدستور لکھی جاتی ہیں۔ اور عوام یہی جانتے ہیں۔ کہ یہ تاریخیں بھی اسی کی لکھی ہوئی ہیں جس نے خود کتاب انجیل لکھی ہے *

غرض اس طرح موجودہ زمانہ میں ابتدائے عالم اور ظہور آدم کی تاریخ معین ہوئی۔ آدمی یہ لکھا ہوا دیکھکر اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے کہ کائنات ۲۳- اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح اتوار کے دن پیدا کی گئی۔ آدمؑ اور حوّاؑ اس کے ۵ دن بعد ۲۸- اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح جمعے کے دن پیدا کئے گئے۔ ایسی یقینی اور ٹھیک ٹھیک تاریخ اور وقت پڑھکر اپنے حواس پر شبہ ہوتا ہے۔ کچھ ہنسی آتی ہے اور کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہمارا مضمون بہت سنجیدہ اور متین

ہے۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کہ شاید اسقف اعظم اشر ابوالبشر کا ہمجولی اور خالق کائنات کا صلاح کار تھا۔ خیر۔ باقی تمام تاریخیں بھی ایسے ہی یقین اور دلیری سے معین کی گئی ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ہمارا تعجب بیجا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اشر کا زمانہ ترقی کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ جب لوتھر[1] کو مرے کل ۶۰-۷۰ برس ہوئے تھے۔ لوئیس[2] چہاردہم کی جوانی تھی۔ اور امریکہ کی نوآبادیوں کا بچپن۔ ایسے زمانے میں اس سے زیادہ صحیح اور محققانہ باتیں دریافت کرنا مشکل ہی نہ تھا۔ بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو اس کا اثر یورپ اور امریکہ کی تحریرات پر اور پھر ان کے ذریعے سے عوام کے دل و دماغ پر اتنا ہُوا کہ وہ جزو ایمان بن کر تعصب مذہبی کی پناہ میں آگیا۔ اور ترقی علوم و فنون جدیدہ کے لئے نہایت ہی مضر اور حارج ثابت ہُوا۔ خصوصاً تاریخی واقعات کی تفتیش مدتوں تک محض اس خیال سے رُکی رہی کہ وُہ انجیل کے مقدس سن کے مخالف نہ ہو جائے۔ لیکن اس مقدس سن کی اصلیت ہم بیان کر ہی چکے ہیں۔ کہ یہ خیالی سن سترھویں صدی کے ایک پادری کی ایجاد تھا۔ جس نے کسی نامعلوم طریقے سے زبردستی اس کو مقدس کتابوں میں گھسا دیا۔ اور توریت کی تحریف کر کے اپنے سن کو اس میں ملا دیا۔ اور بعد میں ملک کی عام جہالت اور نادانی نے اس کو سچ مان کر علم و تحقیق کا بدل سمجھ لیا۔ لیکن انیسویں صدی کے

لہ (Luther) (۱۴۸۳-۱۵۴۶) باشندہ جرمنی و عیسائی مذہب کا ایک بہت بڑا مشہور و معروف مصلح۔ اور عظیم الشان فرقہ پراٹسٹنٹ کا بانی۔ جس نے اپنی عالی ہمتی سے رومن کیتھلک فرقے کا ... توڑ دیا۔ اور ... کے پاپاؤں کو نیچا دکھایا +

لہ لوئیس چہاردہم یا لوئیس اعظم (Louis XIV) لوئیس سیزدہم اور این شہزادی آسٹریا کا بیٹا۔ ۱۶ ستمبر ۱۶۳۸ء کو پیدا ہوا۔ ۵ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ستمبر ۱۶۵۱ء کو بالغ العمر قرار دیا گیا۔ اور ۷ جون ۱۶۵۴ء کو رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ ۱۶۶۱ء میں اپنے وزیر اعظم کارڈنل مزارن کی موت کے بعد اس نے عنان حکومت بالکل اپنے ہاتھ میں لیکر سلطنت شروع کی۔ اور بڑے زور شور سے سلطنت کی۔ آخر یکم ستمبر ۱۷۱۵ء کو انتقال کیا۔ فرانس کا سب سے زبردست اور اپنے زمانے میں یورپ کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا۔

کے اخیر میں اس کی قلعی کھل گئی۔ اور اس کو تمام علوم و فنون کی کتابوں میں سے دیس نکالا ملا +

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے سن پیدا ہوئے۔ کچھ دن جیے اور پھر مر گئے۔ جن کی تفصیل باعث تطویل ہے۔ اور براہ راست ہمارے موجودہ سوالوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں ہے +

تحقیقات جدیدہ نے سب سے زیادہ تغیّر و تبدل اس آفرینش عالم کے سال میں پیدا کئے ہیں۔ علم طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی ابتدا ہوتے ہی زمانہ قدیم کے شمار ایام میں غلطیاں معلوم ہونے لگیں۔ دونوں میں سے صرف ایک کا کرنا لازمی تھا۔ یا تو علما اور محققین خود اپنے حواس اور قوے کی شہادتوں کو باطل سمجھیں۔ یا پرانے زمانے کی تاریخ کی تعین سنین کو غلط اور جھوٹا تسلیم کریں۔ اسی اثنا میں علم الالسنہ بھی اپنی شہادت تیار کر لایا۔ نینوا اور بابل کے کھنڈر ہزار ہا سال کی خاموشی اور فراموشی کے پردے سے نکلے اور اشر بینی پال[لہ] کے کتب خانے میں کی مٹی کی تختیوں نے ہماری دلچسپی اور تعلیم کے لئے اپنی پرانی کہانی سنانی شروع کی۔ علمانے ان تیر نما[۲] حرفوں کو پڑھا اور ان کا ترجمہ کیا۔ مصر کی قدیم تصویروں نے بولنا شروع کیا۔ اور اس کے کہنہ میناروں

[لہ] (Assur-bani-Pal) سلطنت بابل اور نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ جو ۶۶۷ء قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ اس کے زمانے میں وہ سلطنت اپنے منتہائے عروج پر تھی۔ اور اس کی متواتر فتوحات نے دنیا کے زر و مال کا دروازہ اس پر کھول دیا تھا اور یہی اس سلطنت کے زوال کا باعث ہوا۔ اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اپنے علم و شان کے لحاظ سے بے مثل تھیں۔ نینوا کا کتب خانہ اس وقت تک کے کتب خانوں میں سب سے بڑا تھا۔ اور اس میں تمام دنیا کے علمی ذخیرے جمع کئے گئے تھے۔ اور قدیم زبانوں کی کتب لغت اور قواعد تیار کی جاتی تھیں۔ مگر ان تمام محاسن کے باوجود بھی اس کا نام ظلم و ستم اور عیاشی و شہوت پرستی کی وجہ سے داغدار ہے۔ آخر ۶۲۵ء قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا۔ اور اس کے دم کے ساتھ ہی اہل بابل نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ جس سے نینوا اتنا ضعیف ہو گیا کہ اسکے چند ہی سال بعد اہل بابل کے ہاتھوں اسکا خاتمہ ہو گیا

[۲] (Arrow headed or Cuniform letters) ابتداءً یہ کلدانیوں کی ایجاد تھے۔ بابل میں مٹی کی تختیوں پر ان کی کتابت کی جاتی تھی۔ نویں صدی قبل مسیح میں چند قبائل آرمینیا نے اپنے بعض حروف انہی سے مستعار لیئے۔ اس کے بعد علاقہ میڈیا کے تورانی باشندوں نے بھی یہی کیا۔ دارا کے زمانے میں خود ایرانیوں نے اپنے چالیس تیر نما حروف تہجی اسی ماخذ سے لئے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس طرز تحریر کا وقت ایجاد تین ہزار سال قبل مسیح کے قریب ہے +

Marfat.com

نے اپنے خزانے کھولے - آدمیوں کی نظر صاف ہوئی - بصیرت بڑھی - اور گزشتہ زمانے کی عظمت کے سامنے موجودہ تعین اوقات کی نمایاں تنگی اور غلطی واضح ہوتی چلی - تحقیقات سے ثابت ہؤا کہ ہندی اور چینی تاریخیں حضرت مسیح سے بائیس سو برس پہلے تک پھیلی ہوئی ہیں - سرجان گارڈنر ولکنسن نے ثابت کیا کہ مصریوں کا چوتھا خاندان چھبیسویں صدی قبل مسیح میں شروع ہؤا - ایک اور محقق نے وہاں کے پہلے خاندان کی ابتدا کا سال سنہ ۳۸۹۲ قبل مسیح ٹھہرایا - فرانس کے نہایت مشہور اور فاضل مصری محقق میریٹ[1] نے مینیتھو[2] کی تاریخ اور مصر کے کتبوں سے ثابت کیا کہ مینیز[3] کا زمانہ سنہ ۵۰۰۴ قبل مسیح تک پھیلا ہؤا ہے - بروسس کے قول کے مطابق کلدانیوں کا زمانہ مصریوں سے بھی زیادہ قدیم ہے - اور محقق رولنسن نے قدیم بابل کے پہلے خاندان سلاطین کے لئے سنہ ۲۲۸۶ قبل مسیح قرار دیا ہے - غرض ہر طرف نہایت ہوشیار اور محتاط محققوں نے انسانی ترقی کے دائرے کو اتنا پھیلا ہؤا ثابت کیا ہے کہ خواہ مخواہ تقویم پارینہ نابکار کہنا پڑتا ہے ●

اس تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم کی بہت سی قومیں جو ایکدوسرے سے بالکل الگ الگ اور دور دور رہتی تھیں اب سے ۶ ہزار سے لے کر ۷ ہزار برس سے پہلے معاشرت و تمدن - قانون و قواعد فلسفہ اور تاریخ اور

---

[1] (M. Mariette) (۱۸۲۱ - ۱۸۸۱) ایک فرنچ فاضل اور محقق آثار قدیمۂ مصر - اس نے نہایت مشقت اور جانفشانی سے مصر کے عجائب خانۂ بلاق میں آثار قدیمہ کے ایسے عجائبات جمع کئے جو دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے - اسکی علمی کوششوں نے اسے تمام دنیا میں مقبول خلائق بنا دیا - اور اس کو پاشا کا خطاب ملنے کے علاوہ تمام دول یورپ نے اپنے نہایت معزز خطابوں سے سرفراز کیا - آخر کثرت کار نے اس کو بیکار کر دیا - اور ۱۸۸۱ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا - اور وہ اپنے بنائے ہوئے عجائب خانے کے سامنے ایک قدیم مصری تابوت میں دفن ہؤا ●

[2] (Manetho) مصر قدیم کا ایک پوجاری جس نے بطلیموس ثانی شاہ مصر کے زمانے میں قدیم مصری افسانوں اور داستانوں سے ایک تاریخ جمع کی جو اکثر اغلاط اور مبالغوں سے مبرا ہے - اور جس کی تصدیق جا بجا مصری کتبوں نے کی ہے - یہ تاریخ نہایت قدیم ہے - اور اکثر مصری معلومات کا ماخذ ہے ●

[3] (Menes) موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے مصر کا پہلا تاریخی پادشاہ جس نے شہر میمفس آباد کیا ●

Marfat.com

اور علوم وفنون کے تمام اصول قائم کرکے اپنی ترقی کے جھنڈے
گاڑ چکی تھیں اس کے ساتھ ہی ہم کو ان شہادتوں کا بھی ذکر کردینا چاہیئے۔ جو
امریکہ کے قدیم باشندوں کی یادگاروں میں سے ملی ہیں۔ وسط امریکہ کے
کھنڈر۔ اور کوہ انڈیز کی چوٹیوں پر سنگین محل اور معبد ہر ایک غور کرنے والے
آدمی کے دل میں انسانی قدامت کو اور بھی زیادہ جانشین اور مستحکم کردیتے
ہیں ۔

خلاصہ مناسب ہے کہ ناظرین کو تمام شہادتیں از سر نو یاد دلانے کے لئے
ہم بالاختصار مذکورۂ بالا بحث کو دہرائیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ علم ہیئت کے
لحاظ سے زمین کی انتہائے سردی اب سے کم و بیش ۷۵ ہزار سال پہلے کم
ہونے لگی تھی۔ اور اسی وقت سے برفانی دریاؤں میں طغیانی شروع
ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں سے انسانی ابتدا کا وقت اب سے کم و بیش
۳۵ ہزار سال پہلے معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ علم طبقات الارض کی شہادت
تھی۔ اگرچہ براہ راست ابھی تک اس سے انسانی ابتدا کا زمانہ بالکل اتنا
ہی قدیم ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ علم ہیئت کے لحاظ سے ہم نے کہا ہے۔
مگر اس سے کچھ بہت کم بھی نہیں ہے۔ اور ہر قسم کی غلطیوں اور ہر قسم
کے ذاتی تعصّبوں کے حق چھوڑنے کے لئے دس ہزار سال کم کردینا نہایت
کافی ہوگا۔ اس سے ابتدائے انسان کا زمانہ کم و بیش ۲۵ ہزار برس پہلے
ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس تخفیف سے علم ہیئت کی غلطی
معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ طبقات الارض کی تحقیقات انسان کی
ابتدا کو اتنی قدیم ثابت نہیں کرسکی۔ بلکہ صرف اس کی حدادنے دکھا سکی
ہے۔ اس علم کی تحقیقات پر اس جواب کی اصل بنا ہے باقی تمام علوم و فنون
صرف اس کی تائید یا تاکید کرنے والے ہیں اور بس۔ چنانچہ گو آثار قدیمہ کی
تحقیقات تعین اوقات کے لئے طبقات الارض پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے
کہ دونوں کے نتائج بالکل متفق ہیں۔ اور اس سے بھی انسانی قدامت کسی طرح
۲۵ ہزار سال سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہی حال نباتات قدیمہ اور تشریح الانسان

Marfat.com

کا بھی ہے ✦

علم الاقوام اور تہذیب الاقوام سے ان نتائج کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور تاریخ وقصص وغیرہ بالواسطہ ان کے مؤید ہیں ✦

گزشتہ صفحات میں ہم نے انسان کی ابتدائی حالت کی بابت وہ تمام قیاسات بیان کر دیئے ہیں۔ جو نوع انسان کی موجودہ علمی حالت سے نکلنے ممکن ہیں۔ اگرچہ ابھی بہت سی باتیں مشکوک ہیں۔ بہت سی شہادتیں نامکمل ہیں۔ قیاس اور تخمینے میں بہت سی غلطیوں کا امکان ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر پھر بھی تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم اتنا ضرور پورے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان سطح زمین پر ابسے ۲۰ ہزار برس پہلے ضرور ضرور موجود تھا۔ ہاں ناظرین کو اتنا اور بتا دینا چاہیئے کہ یہاں ابتدائی انسان سے ہماری مراد وہ جاندار ہیں۔ جو کچھ کچھ عقل و تمیز رکھتے تھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر چلتے پھرتے تھے۔ تہذیب اور شائستگی کی نہانی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر اور سب باتوں میں اعلےٰ درجے کے جانوروں سے بالکل مشابہ تھے بجز اس کے کہ اپنے ادنےٰ آلات کو گھڑ بھی سکتے تھے۔ اور آگ بھی جلا سکتے تھے ✦

باب ہشتم

جنّت کی تلاش

ظہور انسان کے وقت کی تفتیش کے بعد ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ یہ ظہور ہوا کس جگہ۔ کیونکہ ہماری زمین کی تاریخ میں ایک وقت تھا۔ جبکہ یہاں ہماری نوع کا وجود نہ تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ کسی نہ کسی طرح یہاں ہمارے بزرگ پیدا ہوئے۔ اور ان سے نوع بڑھی۔ اور پھلی پھولی۔ اس لئے ضرور

ہے کہ ان کے ابتدائے ظہور کے لئے کوئی جگہ بھی ہو جہاں سے پھیل کر نوع انسان نے تمام روئے زمین کو آباد کیا۔ تحقیق۔ قیاس اور محض من گھڑت افسانوں نے اس سوال کو حل کرنا چاہا ہے۔ مگر ہم موجودہ ترقی کے بعد بھی اس کا درست جواب دینے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سوال ایک اور سوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس پر ہم اس کے بعد غور کرینگے۔ وہ سوال نوع انسان کی اصل کا اتحاد یا اختلاف ہے۔ پہلی صورت میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ ابتدائی آدمیوں کے لئے ڈھونڈھنی چاہیئے۔ اور اگر دوسری صورت کو درست مان لیں تو پھر بہت سے مقام تلاش کرنے چاہئیں۔ جو بڑی بڑی مختلف نسلوں کے لئے موزوں اور مناسب ہوں +

موجودہ زمانے کے علما میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جنہوں نے تمام امور پر غور کر کے آخر انسان کے مختلف الاصل ہونے کو تسلیم کر لیا ہے ان کے نزدیک نوع انسان مختلف جگہوں میں مختلف وقت پیدا ہوئی اور بڑھی۔ مثلاً افریقہ اور آسٹریلیا کے حبشیوں کا سرچشمہ الگ ہے۔ ایشیائی مغلوں اور تاتاریوں کا الگ۔ مجمع الجزائر والوں کا الگ۔ شمالی ایشیا کے خانہ بدوشوں کا الگ۔ آریاؤں کا الگ۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کا الگ۔ ان مختلف مقامات سے آدمیوں کی الگ الگ نسلوں کی بیلیں پھوٹیں۔ اور تمام سطح زمین پر چھا گئیں +

یہاں ہم ان دونوں مخالف مسلکوں کے حسن و قبح پر بحث نہیں کرتے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اختلاف اصل کی صورت میں ہمارے اس موجودہ سوال کی دلچسپی بالکل کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ نوع انسان ایک سے زیادہ جگہوں سے بڑھی ہے۔ تو پھر اس کی ابتدائی جا ہائے رہائش دس ہوں یا سو (آب چو از سر گزشت چہ یک نیزہ چہ یک دست) حقیقت میں پھر ہم کو یہ مان لینا ہوتا ہے کہ مختلف انقلابات کے بعد ساری سطح زمین انسانی رہائش کے قابل ہو گئی۔ اور مختلف جگہوں میں مختلف نسلوں کے آدمی پیدا ہو گئے۔ ہم یہاں صرف اتحاد اصل کے اصول کو مان کر ابتدائے ظہور انسان کی جگہ

Marfat.com

تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اصول واقعات کے زیادہ مطابق ہے اس اصول کے مانتے ہی ہمارے موجودہ سوال کی اہمیت اور دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے +

اس بارے میں اقوام مغرب کا عقیدہ عبرانی کتب مقدس سے لیا گیا ہے۔ جو پہلے بنی اسرائیل کے اصول مذہبی کی بنا تھیں۔ اور بعد میں تمام مسیحیان عالم کے دین وایمان کا ماخذ بنیں۔ ان کتابوں میں خلقت آدم کی جو طرز اور جو جگہ لکھی ہوئی ہے۔ وہ ان عظیم مذہبی اصولوں کا جزو ہے۔ جنہوں نے اقوام مغرب کی تہذیب پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہاں اس ذکر کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس ابتدائے آفرینش آدم کا منظر "عدن کے ایک مشرقی باغ" میں دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "عدن میں سے ایک دریا بہتا ہے جو اس باغ کو سیراب کرتا ہے۔ اور پھر چار ٹکڑوں میں پھٹ جاتا ہے۔ پہلے ٹکڑے کا نام پائسن ہے۔ جو تمام سرزمین ہیویلیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور جہاں عمدہ سونا نکلتا ہے۔ وہاں لعل اور زمرد بھی ہیں۔ دوسرے دریا کا نام گائی ہن ہے۔ وہ تمام ملک حبش میں پھیلا ہؤا ہے۔ تیسرے دریا کا نام ہیڈیکل ہے۔ اور یہ شام کے مشرق میں بہتا ہے۔ چوتھا فرات ہے" یہ گویا توریت کے انسانی ابتدا کے منظر کی حد بندی ہے +

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ عدن ہے کہاں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس جگہ کو موجودہ جغرافیے کے لحاظ سے کسی نقشے پر دکھا سکیں۔ گزشتہ زمانے کے بہت سے علما نے اس کی بحث کوشش کی ہے۔ پہلی قابل لحاظ بات تو یہ ہے کہ حال کے جغرافیے میں ان چاروں دریاؤں میں سے صرف ایک یعنی فرات پایا جاتا ہے۔ باقیوں کے یا تو نام بدل گئے ہیں۔ یا وہ معدوم ہو گئے۔ یا وہ تھے ہی محض افسانہ۔ دریائے فرات کے تمام کنارے کو منبع سے دہانے تک چھان ڈالا ہے۔ یہ دریا آرمینیا کی پہاڑیوں میں سے نکلتا ہے۔ لیکن وہاں نہ دریائے پائسن کا پتہ ملتا ہے۔ نہ ملک ہیویلیہ کا سراغ چلتا ہے۔ دوسرے دریا گائی ہن کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور اگر ملک حبش سے وہی ملک مراد ہے جو اب اس نام سے مشہور ہے تو کوئی دریا آرمینیا سے نکل کر اس کے گرد جا ہی کیونکر

سکتا ہے۔ تیسرے دریا ہیڈیکل کا بھی کچھ نشان نہیں ملتا۔ ہاں اگر اسے دجلہ سمجھ لیں تو خیر۔ مگر وہ شام کے مشرق میں نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر توریت کے فرات کو یہی دریائے فرات مان لیں تو باقی تینوں دریاؤں کا کچھ حال نہیں کھلتا۔ یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ تینوں دریا کسی انقلاب ارضی کی وجہ سے نابود ہو گئے ہیں +

اس ضمن میں ہم کو یہ بیان کر دینا چاہیئے۔ کہ عدن کے متعلق جو قصہ توریت کے باب پیدائش میں مذکور ہے۔ وہی قصہ ایک نہ ایک صورت میں تمام سمیا لیقی قوموں میں زبان زد تھا۔ زمانہ قدیم کے شامی۔ کلدانی۔ عربی۔ اور اسماعیلی اور ان کی اولاد۔ اور خود عبرانی۔ غرض سب کے سب اس قصے کو جانتے اور مانتے آئے تھے۔ اگرچہ اس کے بعض بعض حصوں میں اتنا ہی فرق پیدا ہو گیا تھا۔ جتنا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں۔ اور اس قصے کی ابتدا اس دور دراز کے زمانے میں ہوئی تھی۔ جب عبرانی عبرانی نہ ہوئے تھے اور کلدانی کلدانی نہ بنے تھے +

اگر ہم اس مسئلے پر موجودہ جغرافیے کی روشنی میں بحث کریں تو سب سے زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم توریت والے دریائے فرات کو اس نام کے موجودہ دریا سے مختلف اور جدا خیال کریں۔ مگر اس کا فوری نتیجہ یہ ہے کہ ہم کو عدن کی تلاش میں کوہستان ارمن کو چھوڑ کر اور کہیں توریت کی مذکورہ جغرافی کیفیت کو ڈھونڈھنا ہو گا۔ اور پھر زمین و آسمان۔ اور قیاسات کا میدان سامنے کھلا پڑا ہے +

جنہوں نے اس مضمون پر پہلے کبھی غور نہیں کیا ان کو مقام عدن کے متعلق مختلف زمانوں کے فاضلوں کی عجیب و غریب اور بے معنی و لایعنی رائیں سن کر ضرور حیرت ہو گی۔ بعض بزرگواروں نے تو اس کو روئے زمین سے اٹھا کر تیسرے یا چوتھے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ بعض اور فاضل اس کو چاند کے مدار یا طریق القمر میں خیال کرتے تھے۔ چند آدمیوں کا یہ قیاس تھا کہ عدن خود چاند ہی میں ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ اس کا وجود کرۂ باد

کے طبقۂ اعلےٰ میں ثابت کر دکھائیں۔ بعض محقق جن کے دماغ اس بلند پروازئ خیال سے خالی تھے۔ عدن کی اصلی جگہ اس زمین کے اندر بتلاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی جگہ قطب شمالی جانتے تھے کچھ لوگ اس کی تلاش میں خطِ استوا کی خاک چھانتے تھے۔ کبھی یہ جنت تاتار اور چین میں تجویز کی گئی۔ کبھی وادی گنگا اور لنکا میں سمجھی گئی۔ لیکن اکثر فاضل آرمن ہی میں سرگرداں رہے۔ جنہوں نے لفظ فرات کی صحت استعمال میں کلام کیا۔ وہ عدن کی تلاش میں صحرائے افریقہ میں پہنچے۔ عراق عجم۔ شام۔ پارس۔ عرب۔ بابل عراق عرب اور فلسطین بھی اس اعزاز کے مستحق قرار دیئے گئے۔ حال میں بعض لوگ یورپ کی حمایت میں بھی اٹھے۔ اور تھوڑی بہت طبیعی تحقیقات لیکر اُٹھے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے۔ کہ انسان کی سب سے زیادہ پُرانی یادگاریں اب تک وسطی اور غربی یورپ ہی میں پائی گئی ہیں +

اس اختلاف کو دیکھ کر حال کے مورخ کی ہمت نہیں پڑتی۔ اور قدم نہیں اٹھتا۔ سچ مچ اپنے آغاز کے ابتدائی مقام کو تلاش کرنے کے لئے تو دل چاہتا ہے۔ مگر اس جنت یا عدن کا سراغ لگانا جس کا ذکر کتاب پیدائش کے دوسرے باب میں تحریر ہے۔ کار دشوار اور خیال محال ہے۔ موجودہ جغرافیہ روئے زمین کے کسی مقام کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ عدن کے متعلق اتنی مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں کہ ان سب کو ایک جگہ دکھانا اس کے متلاشی کے لئے ممکن نہیں۔ ہاں جو کوئی پہلے ہی سے کسی مقام کو عدن تسلیم کئے ہوئے ہے۔ اس کو کسی ثبوت اور دلیل ہی کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اس کا مدعا پہلے ہی اس کے دل میں ثبت اور اس کے ذہن میں ثابت ہو چکا ہے۔ مگر جو محقق خالی الذہن ہو کر سچے دل سے ایسے مقام کو ڈھونڈھنے نکلتا ہے۔ اس کو کرۂ زمین کے گرد پھر کر بھی اسی طرح ناکام اور بے نیل مرام واپس آنا پڑتا ہے +

اس مسئلے کی تفتیش کے لئے اثبات کی بجائے تردید زیادہ مناسب ہے۔ یعنی ہر ایک جگہ جو مقام عدن نہیں ہو سکتی۔ اُسے نکال دینا چاہئے چنانچہ

Marfat.com

ہم یقینی دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ مذکورہ بالا جگہوں میں سے کوئی بھی عدن نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کوہستان آرمینیا کی طرف اکثر نظر دوڑتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی دریا وسط افریقہ کے پاس سے نہیں گزر سکتا۔ اسلئے عدن کا یہاں ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اور ایسے مقامات کو بھی تاویلوں اور توجیہوں سے ثابت کرنے کی بجائے رد کر دینا چاہیئے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ایسا قیاس قائم ہو سکے جس کے ماننے میں کوئی ناقابل تردید مشکلات حائل نہ ہوں۔ اور ساتھ ہی وہ قیاس تمام علوم طبیعی کی موجودہ تحقیقات کے مطابق ہو۔ تو کم سے کم محض امتحانی طور پر ہی اس قیاس کو ظہور انسانی کی ابتدائی جگہ کے مسئلے کا جواب مان لینا چاہیئے۔

اب ہم ان مجوزہ مقامات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً ان جگہوں پر تو بحث کرنا ہی عبث ہے۔ جو روئے زمین پر ہی نہیں ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ آدمی کسی دوسرے کُرے میں پیدا ہوا تھا۔ تو اس کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے توہمات کی غلطی ثابت کرنا اپنے آپ کو احمق اور مسخرہ بنانا ہے۔ وہ نوع انسان کے بچپن کے خیالات تھے۔ بچّے اب تک بھی جنت کو چاند میں جانتے ہیں۔ تقاضائے سن سے ان کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ حضرت آدمؑ کسی اور جگہ آسمان پر پیدا ہوئے تھے۔ پھر آسمان جھک کر زمین سے آ لگا۔ اور آخر ان کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے ان کو اس دنیا میں چھوڑ کر پھر واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ یوں ہماری دنیا آباد ہو گئی۔ یہ سب کچھ بہت دلکش اور دلچسپ سہی۔ مگر اس کی وجہ سے جوانی کی پوری طاقتیں اپنے خیالات کے اظہار سے کیوں رکی رہیں۔ انسانی بہبودی اور خوشحالی کا دارومدار ان بچپن کی باتوں پر کیوں سمجھا جائے۔ دنیا و مافیہا کے کاروبار کا انحصار ان ابتدائی کہانیوں پر کیوں کہا جائے۔ کیا نوع انسان کا آغاز اور انجام اور عالم کون و مکان کا انتظام بچوں کا گھروندا ہے۔ کہ محض بچپن کے دل خوش کن خیالات کے مٹ جانے سے مٹ جائے۔ کیا زمین و زماں کی خلقت اور ثوابت و سیارات کی حرکت صرف کہانی ہے۔ کہ لفظوں کے الٹ پلٹ ہو جانے سے الٹ پلٹ جائے۔ حقیقت میں ہم تصوّر نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

کہ کوئی ذیعقل فرد بشر اس کو تسلیم کرے کہ ہماری ابتدا کی جگہ اس معمولی مادی اور حقیقی سطح زمین پر نہ تھی۔ بلکہ کسی اور کرے میں واقع تھی +

اس کے بعد ہم کو تحقیقات علمی کی روشنی اور قیاس صحیح کی رہنمائی سے اس بھول بھلیاں میں اپنے پہلے گھر کا کھوج لگانا چاہیئے۔ قدیم دنیا کی جغرافی کیفیت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سے مقامات میں ہماری ابتدا نہیں ہوسکتی تھی۔ شمالی اور مرتفع حصہائے زمین نہ صرف آغاز کے لئے۔ بلکہ ہماری رہائش وقیام کے لئے بھی موزوں نہ تھے۔ کیونکہ جب نئی اور پرانی دنیا میں انسان نے دریاؤں کی تہ اور غاروں کی خاک میں اپنے آثار چھوڑنے شروع کئے۔ وہ وہی زمانہ تھا۔ جب ہماری دنیا نے سردی کی کمی کے بعد اپنے برفانی لحاف سے سر نکالنا شروع کیا تھا۔ اس لئے آج کل کے سرد مقامات کا اُس زمانے میں یخ پوش اور ناقابل رہائش ہونا بدیہی ہے۔ اور یہ قیاس بجا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کرۂ شمالی میں پچاس درجے عرض بلد سے اوپر کا کُل حصّہ برف میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے ہم کو عموماً جنوب میں یا شمال کے خاص خاص مناسب مقامات میں اپنے ابتدائی وطن کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ اس طرح کے چند قواعد و قوانین سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہماری تلاش کے لئے مقامات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اتنا وسیع ہے۔ کہ دنیا کے تمام براعظموں کے بڑے بڑے آباد ٹکڑوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اگر اس تلاش میں ہم کو طبقات الارض اور جغرافیہ سے زیادہ مفید اور مناسب معاون اور مددگار نہ ملتے تو غالباً ہم بھی اپنے آبائی وطن سے ایسے ہی بے خبر رہتے۔ جیسے ہمارے بزرگ رہے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہے +

علم الاقوام۔ تہذیب الاقوام۔ علم الالسنہ۔ تاریخ اور قصص ہمارے لئے نہایت ہی مفید اور معتبر شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ قوموں کے ابتدائی تفرقے اور خاندانوں کے شروع شروع کی مہاجرت کے جغرافیہ بعض اور علوم طبیعی کی مدد سے ہم کو اپنے جداجدا افتراق تک لے جاتے ہیں۔ اور نزدیک آگے انہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس جگہ سے یہ نہریں نکلیں۔ اس طرح ان علموں کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تاریخ اور قصص سے پتہ پوچھتے۔ اور قیاس صحیح سے سراغ لگاتے

لگاتے ہم اس قطعہ زمین تک پہنچتے ہیں۔ جو ہمارے بزرگوں کا اصلی وطن تھا۔

باب نہم

اصلی وطن

مہاجرت اقوام کا ذکر یہاں قبل از وقت ہوگا۔ وہ کتاب کے ایک دوسرے جزو کے لئے خاص ہے۔ یہاں ضمناً یہ دیکھنا مقصود ہے کہ علم الاقوام ہمارا اصلی وطن کہاں بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر سمیا طیقی نسل ہی کو لیجئے فلسطین میں رہنے والے بنی اسرائیل وہاں کے اصلی باشندے نہ تھے۔ بلکہ مصر سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ مصر بھی ان کا اصلی ملک نہ تھا۔ کیونکہ وہ کنعان کے رہنے والے تھے۔ جہاں وہ وادی فرات کے نچلے حصّے سے آکر آباد ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کے قصوں اور تاریخوں میں اس نقل مکان کا پورا اور درست ذکر ہے۔ اور اس سے سمیا طیقی لوگوں کے آنے کی جگہ یا کم از کم اس جگہ کی سمت کا تو اشارہ ملتا ہے۔ ابتدائی زمانہ ان ابتدائی قوموں کے انتقال مکان کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ یونانیوں کا ایشیا کی طرف سے آنا ایسا ہی یقینی ہے۔ جیسا ونڈال[1] کا شمال کی طرف سے اُترنا۔ طالب علم کو اس مضمون پر سرسری طور پر غور کرنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی افتراق اقوام بھی اور تمام دنیائی کاروبار کی طرح قواعد اور آئین کا پابند تھا۔ جن سے مختلف ملکوں کو آباد

---

[1] ونڈال یورپ کی ایک خانہ بدوش اور صحرانشین قوم جو پہلے جرمنی کے شمال میں آکر آباد ہوئے۔ دوسری صدی مسیحی میں انہوں نے بوہیمیا میں سکونت اختیار کی۔ اور ایک صدی بعد انہوں نے سلطنت روما پر دست درازی شروع کی۔ انہوں نے چوتھی صدی کے وسط میں عیسائیت اختیار کر لی۔ پانچویں صدی کی ابتدا میں فرانس اور سپین لیا۔ ۴۲۹ء میں افریقہ کو فتح کیا۔ ۴۳۹ء میں کارتیج لیا۔ اور ۴۵۵ء میں روما کو فتح کر کے اس کی تمام دولت منقولہ کارتیج لے گئے۔ ونڈال آریا نسل کی ایک بڑی قوم ٹیوٹن کے لوگ تھے۔ اور اب یورپ کے اکثر حصے میں یہی آباد ہیں۔

Marfat.com

کرنے والوں کا اصلی ماخذ۔ ان کی ترقی کی سمت اور ان کی قومی خصوصیات کا پتہ لگتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان ابتدائی لوگوں کی مختلف پہلوؤں میں پراگندگی ایسی ہی بے ترتیب تھی۔ جیسے بادل کے ٹکڑے متلوّن مزاج ہواؤں کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ قطعی بات ہے کہ نوع انسان کی ہر ایک حرکت ابتدا سے باقاعدہ رہی ہے +

ان ابتدائی قومی تفرقوں کی غایت و غرض بعض جگہ نمایاں ہے۔ اور بعض جگہ نامعلوم۔ لیکن انسان خواہ وحشی ہوں یا شائستہ ہمیشہ کسی منشا کو مدنظر رکھکر کام کرتے ہیں۔ محض فضول اور بیکار کچھ نہیں کرتے۔ مثلاً اہل ہنود کے بزرگوں کا دریائے اٹک کے منبع کی طرف سے اس کے ساتھ ساتھ دہانے کی طرف بڑھنا محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وہ لوگ ایک غایت اور غرض ملحوظ رکھتے تھے اور اسی کے لئے وہ اس ملک میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ جہاں ان کے اخلاف آج تک موجود ہیں۔ سفید قوموں کا امریکہ میں بحر ظلمات کے کنارے سے بحر الکاہل کی طرف بڑھنا اتفاقیہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ قانون قدرت کے مطابق تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان محض دست و پابستہ کلیں ہیں نہیں۔ بلکہ وہ صاحبان فہم و تمیز ہیں۔ اور یہ عقل و تمیز ان عام اسباب و نتائج سے لی گئی ہے۔ جو دنیا و ما فیہا کو اپنے محیط سائے میں لئے ایک خاص منزل مقصود کی طرف جارہے ہیں +

علم الاقوام کی تحقیق اور تاریخی قصوں کی مدد سے ہم کو اس عظیم الشان سلسلے کے سینکڑوں ڈورے ملتے ہیں۔ جس نے ابتدائی قوموں کو مغربی ایشیا۔ ساحلی افریقہ اور تمام یورپ میں پھیلا دیا۔ ان ڈوروں سے سراغ لیتے لیتے اثبات اور تردید کے ذریعے سے ہم تمام ابتدائی قوموں کے متحد مقام تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس مسئلے پر غور کیجئے جس کے حامی یورپ کو نوع انسان کا اصلی وطن ٹھہراتے ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ تحقیقات آثار قدیمہ اس مسئلہ میں ایک حد تک ان کی رفیق ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے پرانے انسانی بقیے وادی سوم میں پائے گئے ہیں۔ مگر صرف یہ

Marfat.com

دلیل اس اہم سوال کے جواب کے لئے محض ناکافی ہے کیونکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب تک افریقہ اور ایشیا میں۔ یورپ میں دستیاب شدہ انسانی آثار سے پرانے بقیے نہیں ملے۔ مگر یہ یاد رہے کہ خود علم آثار قدیمہ یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ اور یہیں بڑھا ہے۔ اس لئے غالباً ایشیا اور افریقہ کے قدیمی خزانے کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ کہ ہر قسم کے معلومہ تاریخی اور دیگر واقعات اس مسئلے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخی زمانے کی ابتدا سے یورپ کی تمام قومیں اپنے آپ کو مشرقی الاصل خیال کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی حرکت بحیرۂ خزر اور جھیل یورال سے دریائے ڈینوب اور رائن کی طرف تھی۔ یہ بھی قابل لحاظ بات ہے کہ تاریخی زمانے میں بھی قوموں کی آمد ہمیشہ مشرق سے مغرب کی طرف ہی ہے اور اس کے برعکس کبھی بھی نہیں ہوا کہ بحر ظلمات اور بحیرۂ روم کے کناروں والے پھر اپنے مخزن کی طرف چلے ہوں۔ اور یورپ والوں کی تمام طاقت اور تدبیر اس مشرقی دراندازی کے روکنے میں ناکام رہی۔ غرض آریا نسل کے تمام افسانے اور تاریخ قدیم کی تمام شہادتیں یہی ثابت کرتی ہیں۔ کہ یورپ اور مغرب کی تمام بڑی بڑی قوموں کا اصلی وطن ایشیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیا کی قوموں میں بجز ایک استثنا کے کوئی بھی ایسی دلیل نہیں۔ جس سے معلوم ہو کہ وہ قومیں بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی زمانے میں بھی یورپ سے آئی ہوں۔ بلکہ تاریخ اور افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائے مغرب کی قومیں مثلاً ترکمان وغیرہ خود اہل یورپ کی طرح اور بھی دور دراز کے مشرقی حصے سے آئی ہیں۔ غرض اس قسم کی تمام بحث اور ان تمام علموں کی چھان بین سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ یورپ اور ایشیا کے عربی حصے کے تمام باشندے تاریخی زمانے کی ابتدا سے ہزاروں برس پہلے دور مشرق سے آئے تھے۔ اس بارے میں علم الالسنہ کی شہادت بھی قابل غور ہے۔ گزشتہ صدی کے آخری حصے میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ یونانی اور سنسکرت ایک ہی شاخ کی دو ٹہنیاں ہیں۔ اور اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ قدیم ہندی اور یونانی بھی ایک ہی خاندان کے دو بھائی

Marfat.com

ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یا تو یونانی مشرق سے مغرب کی طرف گئے یا قدیم ہند و یورپ سے ایشیا میں آئے۔ مگر یہ موخر الذکر مسئلہ بالکل بے بنیاد اور کمزور خیال کیا جاتا ہے۔ اور علماے علم الاقوام اس کو بالکل ناممکن جانتے ہیں۔ اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ یورپ اور ہندوستان والوں کے بزرگ وسط ایشیا سے اٹھے اور مدتوں تک آوارہ و سرگرداں پھرنے کے بعد لڑ بھڑ کر ان دور دور کے ممالک پر قبضہ کر بیٹھے۔ جہاں تاریخی زمانے میں ان کی اولاد بڑی بڑی نامی قومیں بن کر حکمراں نظر آتی ہیں +

یہ بھی یقینی ہے کہ اس مغربی پھیلاؤ کے وقت یہ لوگ اپنے باپ دادا کی حاصل کردہ علم و زبان۔ آئین و قوانین رسم و رواج۔ عادات رزم و بزم اور عزم بالجزم اپنے ساتھ لائے تھے +

اسی طرح یہ بھی دکھایا جا سکتا ہے کہ ابتدائی لوگ وسط افریقہ سے بھی مغربی ایشیا میں نہیں آئے۔ کیونکہ اس مسئلے میں تاریخ۔ افسانے۔ علم اللسان۔ اور علم الاقوام متفقاً اس کے مخالف ہیں۔ ہاں خود افریقہ کے غربی حصے۔ شرقی ملکوں کے باشندوں نے آگے بڑھ کر آباد کئے ہیں۔ اور ایام قدیم میں وہ آباد اور بڑے بڑے شہر جو بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر بستے تھے۔ انہی مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے آدمیوں کے آباد کردہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ پرانا مصر ہے۔ کارتھیج اس کے سامنے کا بچہ تھا۔ افریقہ کے سب سے زیادہ مغربی حصے میں کہیں کہیں اس انسانی سیلاب کی لہر کو پہاڑوں یا سمندروں کے قدرتی موانع نے پھر تھوڑی دور تک مشرق کی طرف لوٹا دیا ہے۔ اس کی مثالیں یورپ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر اس علم کے تمام جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ محض مستثنیات ہیں اور خود قاعدہ کی کلیت پر دال ہیں۔ اگر مغربی ایشیا کی اقوام میں ہم کو کوئی ایسی سیاہ فام قوم ملے۔ جس کی طرز و وضع۔ مذہب اور زبان وسط افریقہ کے حبشیوں سے ملتی ہو تو یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاید کسی زمانے میں افریقہ کے لوگ بحیرۂ قلزم سے گزر کر خلیج فارس کی طرف بڑھے ہوں۔ مگر ایسی شہادت نایاب ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر ایک تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا والے ہی ساحل افریقہ پر

خط استوا تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی نوع انسانی خلیج فارس سے بحیرۂ قلزم اور ملک حبش کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اب سے ۸ - ۱۰ ہزار برس پیشتر مصریوں کے بزرگ ادھر سے ادھر بڑھ کر وادی نیل میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور مدتوں کی ترقیوں کے بعد ان مشہور خاندانوں کے بانی ہوئے۔ جو تاریخی زمانے سے کچھ پہلے کے دھندلکے میں ایسے نظر آتے ہیں۔ جیسے طلوع آفتاب سے پہلے دور کی اونچی اونچی چوٹیاں ٭

ان کو چھوڑ کر اگر قوم مغول کی طرف نظر کریں تو وہاں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس قوم کے اصلی آدمی اندرون ملک میں ساحل بحر سے دور آباد ہیں۔ سمندر کے کنارے اور جزیروں کے رہنے والے نو پیدا شدہ خاندان ہیں۔ جاپانی چینیوں سے زیادہ نو عمر ہیں۔ اور مجمع الجزائر کے باشندے قوم مغول سے بہت پیچھے کے ہیں۔ اس لئے یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ مشرقی ایشیا والوں کے پھیلنے کا سرچشمہ وسط ایشیا تھا۔ جہاں سے وہ بحر الکاہل کے کنارے کی طرف چلے۔ مگر ان کے پھیلاؤ کی طاقت نے ان کو ساحل بحر پر بھی رکنے نہ دیا بلکہ ان کی عظیم الشان لہر بر اعظم سے دور دور تک کے جزیروں تک پہنچی ٭

اگر سیاہان افریقہ کو علم الاقوام اور علم الالسنہ کے نکتۂ خیال سے دیکھیں تو ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ لوگ صرف وسط اور جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا اور میلنشیا میں پائے جاتے ہیں۔ افریقہ میں تفرقۂ قومی کے لحاظ سے یہ لوگ مشرق سے وسط اور مغرب کی طرف جزائر کیپ ورڈ کی جانب میں پھیلے ہیں۔ ان حبشیوں کی تقسیم بھی اس مسئلے کی مخالف ہے۔ جس میں یورپ کو جائے آغاز قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان حبشیوں اور آسٹریلیا وغیرہ کے اصلی باشندوں اور اہالی یورپ کے کسی طبقے میں کوئی تعلق جسمانی یا دماغی نہیں پایا جاتا۔ اس بارے میں ایشیا کا بھی یہی حال ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے منتہائے جنوب کے باشندوں کے علاوہ (یہ لوگ حبشیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں) باقی تمام اقوام ایشیا سیاہان افریقہ سے ہر بات میں بالکل الگ ہیں۔ اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حبشیوں کا سرچشمہ وسط افریقہ کے سوا اور کسی بر اعظم میں قرار نہیں پا سکتا

Marfat.com

ہاں وسط افریقہ ہی ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں سے تمام مختلف ملکوں کے حبشی آسانی سے اپنی اپنی موجودہ جگہوں میں پھیل سکتے ہیں۔ اور جس سے ہمارے مسلمہ اصول اور تحقیقات کی مخالفت بھی نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس میں بھی بعض سخت مشکلیں ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو مشرقی افریقہ سے آسٹریلیا اور میلنیشیا تک جانے میں بحر ہند کے ہزارہا میل لمبے سمندر کو عبور کرنا پڑا ہوگا۔ اور یہ بات ان کی موجودہ ترقی کی حالت دیکھکر بالکل خلاف قیاس اور بعید از عقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خیر اگر ہم حبشی نسلوں کو بے انتہا قدیم مان کر ان کی پراگندگی کے لئے مشرقی افریقہ کا کوئی ٹکڑا مان بھی لیں۔ تو مشرقی ایشیا کی قوم مغل اور مغربی ایشیا اور یورپ کی سرخ رنگ قوموں کو بھی ان حبشیوں سے ماخوذ کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اور بجز اس کے کچھ چارہ نہیں رہتا کہ ہم نوع انسان کو مختلف الاصل مانیں۔ اور سرخ اور سیاہ نسلوں کو شروع ہی سے الگ الگ ماں باپ کی اولاد جانیں۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی اولاد بتانا زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے۔

اسی قسم کی دلائل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا نوع انسانی کا سرچشمہ ہونا محال ہے۔ ہم کو امریکہ کے سفید و سیاہ رنگ باشندوں کی تاریخ ورود اچھی طرح معلوم ہے۔ اگرچہ تمام براعظم امریکہ میں وہاں کے رہنے والوں کی قدامت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ ایشیا اور افریقہ کے لوگ امریکہ سے نکل کر روے زمین پر پراگندہ ہوئے۔ بالکل ناممکن اور خلاف واقع ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کے تمام رسم و رواج۔ طرز و انداز۔ صورت و سیرت غرض ہر ایک خصوصیت نسل مغول سے ملتی ہے۔ اور قرین قیاس ہے کہ غالباً یہ لوگ یا تو ایشیا کے شمال مشرقی گوشے سے نکل کر شمالی امریکہ میں پہنچے ہونگے یا مجمع الجزائر میں سے جزیروں جزیروں میں ہوتے ہوئے جنوبی امریکہ میں آئے ہونگے۔ لیکن ان کو ماخذ مان کر ان کی اولاد کو سمندر کے بیچوں بیچ میں سے ان عظیم الشان اور آباد براعظموں میں پہنچانا تمام تحقیقات علوم موجودہ کے برخلاف اور ہر ایک

قیاس صحیح کے برعکس ہے +

موجودہ بحث میں ہمارا سب سے بڑا سہارا ابتدائی اقوام کے آنے کی سمت معلوم کرنا ہے۔ لیکن عموماً محقق کو اس وجعت قہقری میں تقسیم اقوام کے خطوط باہم مختلط اور گڈ مڈ نظر آتے ہیں۔ اور بعض جگہ بالکل ایک دوسرے کے مخالف اور نقیض بن جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی کاموں میں سے کوئی بھی پورا متناسب اور بالکل باترتیب نہیں ہوتا۔ آثار حیات اپنی خاص ترتیب اور اپنے الگ قاعدے کے پابند ہیں۔ مگر وہ ترتیب بے قیدی ہے۔ اور وہ قاعدہ گوناگونی۔ جاندار اور بالخصوص عقلمند اجسام کی حرکات و سکنات کے قواعد بے جان اور محض مادی اشیا کے حکمران مرتب و یکساں قاعدوں سے بہت زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہیں۔ لیکن اس بحث میں محقق کو ان بے قاعدگیوں اور بے ترتیبیوں سے بھی عمدہ مدد مل سکتی ہے +

اس سوال میں سب سے زیادہ نمایاں یہ بات ہے کہ نوع انسان عموماً مشرق سے مغرب کی طرف بڑھتی معلوم ہوتی ہے گویا تمام آدمی طبعاً آفتاب کی تقلید کرتے ہیں۔ سارا یورپ اور بحیرۂ روم کا کل ساحل اسی اصول کے مطابق آباد ہوا ہے۔ امریکہ پر نظر ڈالیں تو اصلی باشندوں کو چھوڑ کر وہاں بھی یہی قانون قدرت حاوی ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ تمام قومی حرکتیں اسی قاعدے کے موافق ہوتی ہیں۔ عالم نباتات میں دیکھیں تو اگرچہ عموماً بیلیں شاخوں پہ بائیں سے دائیں طرف چڑھتی ہیں۔ مگر کچھ بیلیں اس کے برخلاف دائیں سے بائیں طرف بھی چڑھتی ہیں۔ اسی طرح علم الاقوام کا ماہر جب مذکورۂ بالا سراغوں پر غور کرتے کرتے یورپ اور مغربی ایشیا سے اصلی وطن کو ڈھونڈتا آتا ہے۔ تو وہ آخرکار ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے جہاں یہ آثار گویا زمین کے اندر دفن ہوجاتے ہیں۔ اور کچھ اور نئے نشان زمین میں سے نکل کر مشرق کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ شمال سے جنوب تک جس جگہ اس معاملے پر غور کیا جائے آخر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یعنی وہ اس سے آگے آریا نسل کا کھوج نہیں لگا سکتا۔ پس طبعی اور ضروری بات ہے کہ اس سرزمین کا جہاں سے انسانی اقوام کے آثار قدم مشرق اور مغرب

Marfat.com

دونوں جانبوں میں بڑھے ہیں۔ نہایت غور و خوض سے امتحان کریں۔
اگر کوئی شخص خلیج عمان کے شمالی کنارے پر کھڑا ہو کر نوازشمبلا کی سیدھ میں ایشیا پر نظر ڈالے تو گویا وہ سرزمین اس کے پیش نظر ہوگی۔ جسے گویا انسانی اقوام کا آبشار کہنا چاہیئے یعنی جہاں سے نوع انسان چاروں طرف پراگندہ ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً یہ بات لفظاً صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سرزمین میں بھی بہت سے ایسے ہی اینچ پیچ ہیں۔ جیسے دریاؤں اور ندیوں میں ہوتے ہیں۔ کہ وہ شروع شروع میں بہت سے ہیر پھیر کھاتی ہوئی بڑھتی ہیں یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ان کا حجم و عظم بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایک سمت خاص میں بہتی معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال ایشیا کا یہ حصہ جو گرینج سے ۵۰ اور ۶۰ درجہائے طول بلد کے درمیان میں واقع ہے۔ نہ صرف اہل یورپ کا بلکہ ایرانیوں اور ہندوؤں کا اور ان سے بھی زیادہ وسیع اور منتفرق نسل مغول کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ایشیا مجمع الجزائر اور امریکہ تک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ قطعہ زمین دریائے یورال اور بحیرہ خزر کے کنارے سے شمالاً جنوباً۔ نصف فارس۔ خلیج فارس اور بحیرۂ عرب تک حاوی ہے۔ جہاں تک علم الاقوام کی تحقیقات کی گئی ہے۔ یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام ابنائے نوع ابتدائے مہاجرت میں اسی قطعے سے مشرق یا مغرب کی طرف پراگندہ ہوئے ہیں۔ قوم مغول یہیں سے نکل کر بحیرۂ چین و جاپان اور بحیرۂ اوکھوٹسک کی طرف بڑھی۔ اور اہالی یورپ اسی جگہ سے مشرق کی طرف پھیلے۔ اسی طرح سمیا طبقی اور حمیا طبقی نسلیں اسی جگہ سے پراگندہ ہوئیں۔ اس سے بھی آگے چلیں تو ہم کو پہلے ہی پہلے حبشیوں کی نسل افریقہ کے مشرقی ساحل اور ہندوستان کے جنوبی حصے میں ملتی ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے اور موخر الذکر مشرق کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نسل بھی اس سرزمین سے چلی ہے۔ جہاں سے سرخ اور بھوری نسلیں نکلی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر یہ کہنا کچھ غلط یا مبالغہ نہیں کہ گرینج سے ۵۰ اور ۶۵ درجہ طول بلد کے درمیانی حصہ بر و بحر میں سے تمام انسانی نسلوں نے خروج کیا ہے۔ مگر اس بحث میں ابھی تک یہ سوال تصفیہ طلب

ہے کہ اس قطعہ زمین کا کونسا حصہ ہمارا پہلا وطن تھا۔ اس پر بحث کرتے وقت اس کے شمالی حصے کو تو نکال ہی دینا چاہئے۔ یہ بات بالکل صاف اور یقینی ہے کہ بحیرۂ خزر کے شمالی جانب کے حصے مع ان کے جو دریائے یورال اور وا لگا سے سیراب ہوتے ہیں۔ اپنی شدید سردی کی وجہ سے مدتوں تک ویران پڑے رہے۔ اور ان کے رہنے والے نسبتاً زمانۂ جدید ہی میں بڑی تکلیفیں اور مشکلیں جھیلنے کے بعد اُن میں آباد ہوئے ہیں۔ اس بحث میں ہر ایک بات اسی پر دال ہے کہ کرغیز۔ قلموق۔ کاسک۔ اور روسی مغل اس ملک کے پرانے رہنے والے نہیں ہیں۔ آگے چل کر ہم یہ بھی دیکھینگے کہ انسان اپنی ابتدائی اور وحشیانہ حالت میں بحیرۂ خزر اور بحیرۂ سفید کے درمیانی حصّوں کی سی سخت سردی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ ایسے ملک تب آباد ہوئے جب زمانے کی تادیب نے انسان کو حفاظت جسمانی کے طریقے سکھا کر محفوظ کردیا تھا۔ اور پشتہا پشت تک آس پاس کے سرد ملکوں میں رہنے نے سردی سہنے کا خوگر بنا دیا تھا۔ اس لئے ہم اس قطعہ زمین میں سے ماورائے قاف اور بالائے خزر حصوں کو نکالے دیتے ہیں۔ یہ بات اس کی مؤید ہے کہ سیاہ اور بھوری نسلوں کا اس سرد حصۂ زمین سے پھلنا ممکن ہے۔ کیونکہ حبشیوں۔ اسٹریلیا اور پاپوا والوں کا شمالی عرض بلد کے پچاسویں طبقے کے اوپر سے پھیلنا۔ ہر قسم کی معلومہ تحقیقات اور ہر طرح کے قیاس صحیح کے مخالف ہے۔ مزید براں یہ کہ مذکورۂ بالا قومیں ہر قسم کی قابلیت دماغی و اخلاقی میں اہالیِ شمال سے اتنی پیچھے ہیں کہ یا تو ہم یہ خیال کریں کہ یہ قومیں قانون ترقّی عالم کے برعکس شمال کے اعلےٰ طبقے کے جانداروں سے ادنےٰ درجے کے جانوروں کی حالت اختیار کررہی ہیں۔ یا سرے سے ان کا شمال سے آنا ہی غلط سمجھیں۔

ان خیالات سے ہم شمال سے جنوب کی طرف اُتر کر بحیرۂ خزر اور بحیرۂ عرب کے درمیانی ملک پر نظر ڈالتے ہیں ہم کہہ چکے ہیں کہ آریا نسل کا کھوج یہیں لگتا ہے۔ اور یہیں ان کی قوائے نے اپنا عروج دکھایا ہے۔ یہاں کے موسمی تغیرات کی سختی انسانی تادیب اور تہذیب کے لئے سب سے اچھا تازیانہ

Marfat.com

ہیں۔ یہی جگہ ہے جہاں سے آریا نسل کا سراغ مشرق اور مغرب دونوں طرف چلتا ہے۔ اور اگر فی الواقع ان کا وطن یہی ہے تو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ گویا صرف آریا نسل کے لحاظ سے بحیرۂ فارس اور کوہ قاف کا درمیانی حصہ انسان کا اصلی وطن ہے۔ لیکن اگر نظر کو وسیع کر کے اور نسلوں کو بھی لیں تو اس میں عقدہائے لاینحل پیش آتے ہیں۔ اس حصے میں قوم مغول کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ بحیرۂ خزر اور بحیرۂ اسود کے آس پاس یہ لوگ بکثرت ہیں۔ مگر ایران میں قسم کھانے کو بھی نہیں ملتے۔ بعینہ یہی حال حبشیوں کا بھی ہے۔ یہ نسل کہیں بیسویں درجہ عرض بلد کے اوپر نہیں ملتی۔ شاید کوئی معترض ممالک متحدہ امریکہ کی مثال پیش کرے جہاں کے اصلی باشندے بہت شمال کی طرف چڑھ گئے ہیں۔ یہ سچ ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم صرف قومی مہاجرت اور پراگندگی کو لے رہے ہیں۔ اور امریکہ میں ان کے انتقال مکان کی وجہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ سفید رنگ اقوام کی دراندازی اور دست درازی ہے۔ اس لیئے حبشیونکا ماخذ آریاؤں کے ساتھ ملک باختر قرار دینا ناممکن ہے۔ حبشی ترقی کے میدان میں بھی سفید قوموں سے کوسوں پیچھے ہیں۔ ان کی ساخت جسمانی۔ لیاقت دماغی۔ مسائل اخلاقی ابھی ابھی اسی پرانی حالت میں ہیں۔ ضروری ہے کہ یا تو انہوں نے ترقی معکوس کی ہو۔ یا یہ اپنے وطن موجودہ کے قریب ہی خط استوا کے آس پاس سے بڑھے ہوں۔ مگر ترقی معکوس قانون قدرت کے خلاف ہے۔ ان تمام بحثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین پر کوئی ایسی ایک جگہ نہیں جہاں سے تمام موجودہ نسلیں اپنے موجودہ مقامات میں پھیل سکیں۔ سرخ۔ سیاہ اور بھوری نسلوں کا وطن یکجا ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ موجودہ علمی حالت کے لحاظ سے یہ بات فی الحقیقت محال ہے۔ یعنی گو یہ ممکن ہے کہ اہل آسٹریلیا اور اہل حبش ایشیا کے کسی ٹکڑے سے نکلے ہوں۔ مگر یہ بات اتنی خلاف قیاس اور اس قدر دشوار معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسے ناممکن کہدیں تو بیجا نہ ہو پھر کیا؟ اگر آریا نسل افریقہ یا آسٹریلیا سے نہیں آئی۔ اگر قوم مغول افریقہ اور وسط ایران سے نہیں پھیلی

Marfat.com

اور اگر حبشی نسل ایشیا میں پیدا نہیں ہوئی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مختلف اقوام کا متحدہ وطن ملنا ناممکن ہے۔ ہرگز نہیں۔ ابھی ایک صورت باقی ہے جس کے تسلیم کر لینے سے یہ سب مشکلیں مٹ جاتی ہیں۔ اور مجملاً وہ یہ ہے کہ خشکی اور تری کی موجودہ اور قدیم تقسیم یکساں نہیں ہے۔ کئی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بحیرۂ عرب اور بحر ہند کا شمالی ٹکڑا جزیرۂ مدغاسکر سے مشرق کی طرف آسٹریلیا اور جزیرہ نمائے ملایا تک برابر خشک تھا۔ جو آہستہ آہستہ سمندر میں چھپ گیا۔ اگر یہ خیال صرف ابنائے آدم کی مختلف اقوام کے متحدہ وطن پیدا کرنے کیلئے پیش کیا جاتا تو قطعی مہمل اور لغو تھا۔ مگر اس سطح آب میں چھپے ہوئے براعظم کے وجود کو بہت سی دلیلوں نے قرین قیاس ہی نہیں بلکہ بالکل یقینی کر دیا ہے۔ اور ان دلیلوں کو ہمارے موجودہ سوال یا علم الاقوام سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔

اول تو جغرافیہ بحری میں بحر ہند کے اکثر مقامات کی تھوڑی گہرائی مشہور ہے۔ خط استوا سے ۳۰ درجے جنوب تک اور مدغاسکر سے ۸۰ درجے طول بلد تک اس سمندر کا پانی بہت ہی کم ہے۔ اگر ہم جزیرۂ ماریشس پر کھڑے ہوں تو ہمارے چاروں طرف بہت کم گہرا پانی ہے۔ اس کے ادھر اُدھر بھی بحر الکاہل کی سی گہرائی نایاب ہے۔ اگر کسی بحری حرکت کی وجہ سے یہ سمندر کچھ اتر جائے تو افریقہ اور جزیرہ نمائے ملایا کے درمیان ایک آسٹریلیا سے بھی بڑا براعظم نکل آئے۔ اور یہ بحری حرکت کچھ عجب نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی ایسی حرکتیں بارہا ہو چکی ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اب بھی وہ اپنا کام کر رہی ہیں۔ گو آہستہ آہستہ کئی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براعظم کسی زمانے میں موجود تھا۔ مثلاً بحر ہند کے دونوں کناروں کے درختوں اور جانوروں کی مشابہت ہی اس بات کی گواہ ہے۔ جزیرۂ مدغاسکر اور جزیرہ نمائے ملایا کے تمام پرندے ایک ہی قسم کے ہیں۔ بعض قسم کے ناریل کے درخت جو سنگاپور۔ نیو گنی۔ آسٹریلیا اور مجمع الجزائر کے مغربی جزیروں میں پلے جاتے ہیں۔ یہ درخت بیج وغیرہ کے ذریعہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جائے جا سکتے۔

اور علم نباتات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر یہ تمام علاقے آپس میں ملے ہوئے نہ ہوتے تو ان درختوں کا اتنی متفرق جگہ پایا جانا ناممکن تھا۔

علم طبقات الارض کی تحقیقات اس بات کی تائید کرتی ہے کہ پہلے یہ جگہ سطح سمندر کے اوپر تھی جہاں اب بحر ہند موجیں مارتا ہے۔ بعد میں یا تو یہ زمین نیچے دھس گئی یا سمندر اوپر چڑھ گیا۔ جس سے یہ حصۂ زمین سطح سمندر بن گئی۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ آخر نوع انسان کسی جگہ سے ضرور پھیلی۔ خواہ وہ جگہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ مگر ہوگی ضرور۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جہاں سے تمام موجودہ نسلیں پھیل سکیں۔ اور تمام موجودہ شرائط پوری ہو جائیں۔ اگر کوئی ایسی جگہ مل جائے خواہ خشکی میں ہو یا تری میں جس کی طرف تمام مختلف علوم و فنون کی تحقیقات اشارہ کرتی ہو تو خود یہی بات اس کے لئے ایک زبردست دلیل بن جاتی ہے۔ یہ تمام دلیلیں مل کر ہم کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ نوع انسان کا اصلی وطن وہ سرزمین ہے۔ جو اب بحر ہند میں چھپ گئی ہے۔ اور جسے علمانے **لیموریا** نام دیا ہے۔ یہ مانتے ہی سارا سوال حل ہونے لگتا ہے۔ اور ابتدائی اقوام کی پراگندگی کے راستے نظر آنے لگتے ہیں۔ حبشی مغرب کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اور تاریخی زمانے کی ابتدا میں افریقہ کے ساحل مشرقی پر ملتے ہیں۔ انہی کی ایک دوسری شاخ مشرق کی طرح جاکر آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ اور جنوبی دکن کو آباد کرتی ہے۔ یہیں سے قوم مغول بلوچستان اور مغربی ہندوستان کی طرف بڑھتی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخی زمانے میں سب سے پہلے ان کے آثار انہی حصوں میں ملتے ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ ایک اور قوم بھی بڑھتی ہے جو بلوچستان کے قرب میں ان سے الگ ہو کر آئندہ سرخ یا سفید نسلوں کی ماں بنی۔ یہاں ہم نے یہ باتیں تحقیقات علمی کی حیثیت سے بیان نہیں کیں۔ بلکہ ان کی باہمی مناسبت اور موزونیت دکھانے کے لئے گوش گزار کی ہیں۔ تاہم یہ صرف من گھڑت کہانیاں۔ اور خلاف واقعہ افسانے نہیں ہیں۔ ان کی تائید میں بہت سی سائینس کی دلیلیں دکھا سکتی ہیں۔ مثلاً یہی کہ انسان طبعاً منطقۂ حارہ کا باشندہ ہے۔ اس کی تمام اصلی عادات و ضروریات اسی کی متقاضی ہیں۔

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی گرم سیر طبقوں میں یہ تقریباً اپنی اصلی ابتدائی حالت پر قائم رہا ہے۔ اور ملکوں کی ترقی اس بات کی دلیل ہے کہ وہاں کے حالات وہاں کے باشندوں کی اصلی عادات کے مطابق نہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو قدرتی اسباب کے مقابلے میں اپنی ذاتی کوششوں اور ترقیوں سے کام لینا پڑا۔ لیکن خط استوا کے آس پاس رہنے والے اب تک سب سے زیادہ وحشی اور ابتدائی حالت میں ہیں۔ یعنی ان ملکوں کی قدرتی کیفیات ان کی اصلی خو بو کے مطابق ہیں۔ اور ان کو انسانی صنعت سے مطلق کام لینے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جو اس اپنے اصلی وطن سے نکلے۔ اور شمال کی طرف چلے۔ ان کو شمالی ملکوں کے سخت اور بدلتے ہوئے موسموں نے بہت جلد ان کے برہنہ اور نرم جسم کی مصنوعی حفاظت کے طریقے سکھا دیئے۔ ان کے قوائے کھلنے لگے اور طاقتیں بڑھنے لگیں۔ اور جلد ہی انہوں نے عقل اور صنعت سے قدرت کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا۔ یہیں سے ترقی کا میدان شروع ہوا اور آج اس کا فرق ایک جرمن اور ایک حبشی کی حالتوں سے دیکھا جا سکتا ہے +

غرض یہاں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ابتدا منطقہ محارّہ میں ہوئی۔ اور اس کی ترقی دوری وطن سے علم ہیئت کے لحاظ سے بھی غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں شدت سرما کی وجہ سے اس گرم منطقے کے سوا اور کہیں انسان کا ٹھکانا نہ ہوگا۔ یہ بات اچھی طرح مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ابتدائی آدمیوں کی رہائش کے لئے مناسب جگہ۔ اور آئندہ نسلوں کی ترقی کے لئے موزوں مقام ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ باہم ضد ہیں۔ غالباً اوپر کے فقروں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی۔ انہی قیاسات سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہمارا اصلی وطن ملک لیموریا تھا۔ مگر اس کو بالکل قطعی اور یقینی کہنا بجا نہیں ہے۔ شاید آئندہ تحقیقات اور معلومات سے کوئی اور جگہ اس سے بھی زیادہ موزوں نکل آئے۔ اگرچہ ہمارے ان قیاسات کے بالکل بدل جانے کا چنداں اندیشہ نہیں۔ علوم طبیعی

Marfat.com

کا یہ اصول ہے کہ جو مسئلہ چند مختلف اور بظاہر متضاد کیفیات کو قرین قیاس طور پر حل کر دے اور اس میں کوئی خاص اعتراض بھی نہ ہو تو اسے کم از کم امتحاناً تسلیم کر لیتے ہیں۔ گو اس میں کسی قدر شک کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ ہمارے اس مسئلے کا بھی یہی حال ہے +

اس کی تائید میں ایک اور قابل ذکر شہادت ہے۔ جو اعلیٰ درجہ کے جانوروں کی قدرتی تقسیم سے حاصل کی گئی ہے۔ اگر ہم بیموریا کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم حیوانات کے لحاظ سے یہ دائرہ انتہائے علو پر واقع ہے۔ تمام روے زمین کے حیوانات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں ہم اس دائرے کے پاس آتے جاتے ہیں۔ جانوروں کی قسمیں اعلیٰ ہوتی جاتی ہیں۔ خواہ ہم کسی سمت سے اس حصّے کی طرف چلیں۔ تقسیم حیوانات کی ترتیب اسی کی طرف بلند ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ گویا تمام جانداروں کا بہترین نمونہ اور آثار حیات کی خوشترین مثال اس سرزمین پر ہے۔ یہ ترتیب گویا پکار پکار کر کہتی ہے کہ اس سرزمین کے سوا اور کسی جگہ انسان کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ورنہ ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ وہ قانون قدرت جو نہایت ہی ادنےٰ ذی روح چیزوں سے نہایت ہی اعلےٰ جانوروں تک ایک خاص ترتیب اور انتظام سے آرہا تھا۔ یہاں تک آکر یکایک ٹوٹ گیا۔ کیونکہ انسان اس جگہ پیدا نہیں ہؤا جہاں اس قانون کے مطابق اس کو اشرف الحیوانات کی حیثیت سے پیدا ہونا چاہیئے تھا +

شاید ان نتائج کو علم حیوانات کے چند مسائل و اصول سے واضح کرنا بیجا نہ ہو آسٹریلیا تھیلی دار جانوروں کا گھر ہے۔ اور یہ گرم خون والے جانوروں میں سب سے ادنےٰ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قسم اور ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے مگر یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ ملک ان کا اصل گھر نہیں ہیں۔ بلکہ گویا وہ قسمیں مختلف خطوط ہیں جو آسٹریلیا میں آکر مل جاتے ہیں اور اسے مرکز بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد جنوبی امریکہ پوپلے جانوروں کا وطن ہے۔ جو ترقی میں ان سے ایک زینہ اوپر ہیں۔ شمالی امریکہ کے اصلی جانور گیاہ خوار چرندے ہیں۔ جو ترقی میں تیسرے

درجے کے ہیں۔ منطقۂ حارّہ کے مشرقی کرہ کے حصّے عظیم الشان درندوں کا بن ہیں۔ جو چرندوں سے ایک زینہ اور اوپر ہیں۔ تھیلی دار جانوروں کی طرح یہ سب جانور بھی اکثر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی کثرت اور گوناگونی مذکورہ خاص خاص ممالک کو ان کا اصلی مرکز قرار دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے گویا ترقّی حیوانی کے لحاظ سے آسٹریلیا سب سے نیچے اور مشرق کا منطقۂ حارہ سب سے اوپر ہے +

جب ہم انسان سے اتر کر سب سے اعلےٰ درجے کے جانوروں پر غور کرتے ہیں تو یہ دلیل اور بھی زبردست ہو جاتی ہے۔ وضاحت دلیل کے لئے علماے حیوانات نے روے زمین کے مختلف ٹکڑے کئے ہیں اور ان کے الگ الگ نام رکھے ہیں۔ تاکہ تقسیم حیوانات کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ پہلے ٹکڑے میں تمام یورپ۔ ہندوستان۔ جزیرہ نماے ملایا اور جنوبی عرب کو چھوڑ کر تمام ایشیا اور خط سرطان کے اوپر کا تمام افریقہ شامل ہے اور اس کا نام طبقۂ منجمد قدیمہ رکھا ہے +

باقی افریقہ۔ جزیرۂ مدی غاسکر اور آس پاس کے جزیرے دوسرے ٹکڑے میں ہیں۔ جس کا نام طبقۂ حبش قرار دیا ہے +

ہندوستان۔ عرب جنوبی۔ اور جزیرہ نماے ملایا طبقۂ مشرقی کہلاتے ہیں +

آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ اور مجمع الجزائر کو طبقۂ آسٹریلیا کہتے ہیں +

جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند اور میکسکو کے منطقہ معتدلہ کے ٹکڑے کو طبقۂ حارّہ جدیدہ ٹھہرایا ہے +

اور باقی کی شمالی امریکہ نے طبقۂ منجمدہ جدیدہ نام پایا ہے +

ذیل میں امریکہ کے مشہور فاضل ونشل کا تیار کردہ نقشہ دکھایا جاتا ہے۔ جس سے اعلےٰ طبقۂ حیوانات کی تقسیم واضح کی گئی ہے +

Marfat.com

مندرجہ ذیل قسم کے حیوانات کی تعداد مذکورۂ بالا طبقات میں حسب ذیل ہے

نام جانور	طبقہ اوّل	طبقہ دوم	طبقہ سوم	طبقہ چہارم	طبقہ پنجم	طبقہ ششم
بن مانس	..	۲	۱۰	..	..	..
بندر	۱	۱۱	۲۸	..	..	..
بے بون	۴	۴۲	۲۳	۲	..	..
لیمور	..	۵۰	۵	۱	..	..
میزان	۵	۱۰۵	۶۶	۳	..	..
درندگان	۶۵	۹۰	۹۵	..	۴۸	۴۳
میزان کل	۷۰	۱۹۵	۱۶۱	۳	۴۸	۴۳

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ملک لیموریا جس کو ہم نے انسان کا قدرتی وطن مانا ہے مذکورہ بالا طبقات حبش و مشرق کے درمیان میں واقع تھا۔ اوپر کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اعلےٰ کے حیوان ان دو طبقوں میں کس قدر کثرت سے پائے جاتے ہیں اور گویا انسان سے دوسرے درجے کے جانور یہاں کے سوا کہیں بھی نہیں ملتے درندوں کے لحاظ سے بھی یہ دونوں طبقے دنیا کے اور طبقوں سے دوگنی قسمیں رکھتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اعلےٰ طبقے کے جانور اور خصوصاً بن مانس کے قسم کے بندر صرف بحر ہند کے آس پاس ہی پائے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ ظاہر ہے کہ بحر ہند کی تنگ موج زمین جو کسی زمانے میں منطقہ حارّہ کا ایک بڑا عظیم تھی۔ آثار حیات کے معراج کمال اور اقسام حیوانات کے انتہائے عروج کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ان مقاموں میں نوع انسان کی پست اور وحشیانہ حالت اس امر کی اور بھی تائید اور تاکید کرتی ہے۔ اور ہر قسم کے بن مانس اس حصّہ کی طرف ترقّی کرتے ہوئے آتے ہیں۔ اور اقوام انسان اس کے پاس آتے ہوئے اور بھی گرتی جاتی ہیں۔ اور جوں جوں دور ہٹتی ہیں اسی قدر بڑھتی ہیں۔ سب سے کم درجے کے آدمی دیکھنے ہوں تو پاپوا اور آسٹریلیا میں تلاش کرنے چاہئیں۔ ان سے آگے افریقہ ہیں۔ ان سے اوپر جنوبی امریکہ کے اصلی باشندے۔ پھر شمالی امریکہ کے وحشی۔ اور اوپر مجمع الجزائر اور ایشیا

کے شمال مشرق کے رہنے والے۔ ان کے بعد تمام مہذب آدمی۔ اس کی وجہ ضمناً ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ قرین قیاس بھی یہی ہے کہ انسانی ابتدا اور اور جانوروں کی انتہا سے ملحق ہونی چاہئے تھی۔ جہاں اور حیوانات اپنے اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ پر پہنچتے ہیں۔ وہاں سے انسان کی ادنےٰ سے ادنےٰ حالت شروع ہونی مناسب تھی جیسے ایک صدی کی سب سے پہلی تاریخ اس سے پہلی صدی کے سب سے آخری دن کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ گویا بھوریا کی تہ آب سرزمین سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ بن مانس پالپا کے نہایت ہی ادنےٰ انسان کے ساتھ دست بداماں ہے +

وقت ابتدا کی طرح جائے آغاز میں بھی ابھی تک بہت کچھ شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ ان مسائل پر بحث کرنے والے کو یاد رکھنا چاہئے کہ تمام علوم کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یقینی اور احتمالی۔ انسانی علم کا کچھ حصہ بالکل معیّن اور مدلّل ہے۔ اور کچھ حصہ قیاسی وعقلی۔ انسان کی ہر قسم کی ابتدائی حالت کے متعلق تمام مسائل میں بہت کچھ شک وشبہ بلکہ غلطیوں تک کا شائبہ ہے۔ مگر اس سے ہماری اس تحقیقات کی قدر وقیمت کچھ کم نہیں ہو جاتی۔ اور اگر ہم اس کو بفرض عملی طور پر ثابت کر سکتے تو اس کی جاہ و منزلت میں کچھ بیشی نہ ہو سکتی شاید انسانی طبیعت اپنی ابتدا کے بارے میں زیادہ یقینی اور قطعی باتیں سن کر زیادہ مطمئن و محظوظ ہوتی۔ مگر ہمارے خزانۂ دماغی کی ترقی میں علوم یقینی بھی معلومات قیاسی سے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہوتے۔ کیونکہ ایسے علوم اگرچہ استقامت عقل اور استعانت ذہن کے لئے نہایت عمدہ ہیں۔ مگر ساتھ ہی تمام قوائے دماغی محض ایک الجبری مساوات اور حسابی گر بن جاتے ہیں اور قوت متصوّرہ اور متخیلّہ اگر بالکل بیکار نہیں تو کمزور تو ضرور ہی ہو جاتی ہے حالانکہ صداقت کی تلاش اور حسن کا مدار انہی پر ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ ہمارے اپنے اور کائنات کے متعلقہ خیالات میں شک وشبہ کی آمیزش اور قیاس اور احتمال کی گنجائش نہ رہے۔ ورنہ مصوّروں کے خیال اور شاعروں کے مضمون ہمارے جواہر دماغی کو جلا دینے سے دست بردار ہو جائینگے +

الجُزُوُ الثَّانِی

باب دہم

کیفیّت آغاز۔ حکم قضا یا ترقّی کا مقتضا

ہم حتے الامکان انسان کی پیدائش کے ابتدا سے زمان و مکان پر اچھی طرح بحث کر چکے ہیں۔ اب ہم کو اس اہم سوال پر غور کرنا ہے کہ اس کی ابتدا کس طرح اور کن طریقوں سے ہوئی۔ گزشتہ بحثوں کی طرح یہاں بھی یہ دقّت موجود ہے کہ انسان خود اس کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ اور یہ بے خبری افراد۔ اقوام۔ انواع سب میں یکساں پائی جاتی ہے۔ کسی کو اپنی پیدائش کی کیفیت کی خبر نہیں ہوتی۔ ہوش آتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کی حالت حافظے کی حد سے پرے اور ادراک کے دائرے سے باہر ہے۔ ایک خود ساختہ خیال کے سوا کچھ نہیں۔ ایک اور بڑی دقّت تعصب نے پیدا کر دی ہے۔ ہر فرقے اور ہر قوم میں ابتدائے آفرینش انسان کی داستان پاستان عقائد قومی کا عنوان اور خیالات فلسفی و ہندسی کی جان رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ملکی و قومی آئین و قوانین کا بھی جزو ہو جاتی ہے۔ مگر خواہ کہیں ہو اور کسی صورت میں ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ہر حال میں مسائل صداقت کی تحقیق میں حائل ہوتی ہے۔ اب تک شائستہ سے شائستہ اقوام بھی یہی سمجھتی ہیں کہ آغاز نوع کی وہ پرانی کہانی جو باپ نے دادا اور دادا نے پردادا کی زبانی سنی سنائی ہمارے کانوں تک پہنچائی ہے۔ ہماری روحانی ترقی اور بہبودی کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ اس دلیل کو نظر انداز کر کے ہم بلا تامل کیفیّت آغاز کے مختلف بیانوں اور مخالف داستانوں کی

چھان بین کرتے ہیں۔ اس مضمون پر دو عام عقیدے ہیں +
اوّل یہ کہ دنیا و مافیہا ہر قسم کے حیوانات اور سب طرح کے نباتات ایک حکیم و قدیر علیم و خبیر ذات والا صفات کے حکم قضا توام سے دفعتہً واحدةً پیدا ہو گئے۔ اس تمام کارخانے کے پیدا کرنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور ہر طرح کے جانور صورت و سیرت میں مکمل۔ منّت والدین سے بے نیاز اور اپنے نئے مکان سے ناآشنا بلا واسطہ غیرے دنیا میں موجود ہو گئے +
دوم۔ یہ کہ دنیا اور اس کی تمام زندہ چیزیں اس عمل کا نتیجہ ہیں۔ جسے ترقی یا نشو و نما کہتے ہیں۔ اور یہ تمام حیوانات اور نباتات جن سے اب سطح بر و بحر بھری پڑی ہے۔ چند ابتدائی جرم یا صرف ایک ہی ایسے جاندار بیج سے بڑھے ہیں۔ جس میں نشو و نما۔ تغیر و تبدل اور گرد و نواح سے مناسب ہو جانے کی قابلیت تھی۔ اور یہ ابتدائی جرم اب سے لاانتہا مدت پہلے موجود تھے۔ اور یہ ترقی یا نشو و نما کا زمانہ غیر معدود مدت تک پھیلا ہوا ہے۔ اور اگرچہ اس کا کام نہایت سُست اور آہستہ تھا۔ مگر ابقاے بہترین کے عمل سے رفتہ رفتہ اس کی صورتیں زیادہ پھلتی پھولتی رہیں۔ اور آخر کار بڑھتے بڑھتے آجکل کی مختلف اقسام کے مکمل نمونے پیدا ہو گئے +

مسئلہ ارتقا اور ابقاے بہترین کی مفصل تعریف آگے آئیگی +

ان دونوں مخالف عقیدوں کے متعلق ہمیں کئی باتیں کہنی ہیں۔ اول تو یہ کہ گزشتہ نصف صدی کے تمام علما اور حکما اس معرکۃ الآرا مسئلے پر سب سے زیادہ غور کرتے رہے ہیں۔ اور اکثر مختلف الآرا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ عموماً علماے مذہب اور طبقہ مقلدین نے پہلے عقیدے کی حمایت کی ہے۔ اور فلاسفہ اور فضلاے طبعیات نے دوسرے گمان کو ترجیح دی ہے۔ تیسرے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں کا مابہ الامتیاز خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔ اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں کا اصلی فرق طرز عمل کی بابت ہے۔ ارتقا کے مسئلے نے ابتداے حیات کی توضیح و تشریح کرنے کا نہ پہلے کبھی دعوے کیا ہے۔ نہ اب

کرتا ہے۔ اس کی تحقیقات صرف اس طرز عمل کے معلوم کرنے تک ہے جس نے چند ابتدائی جرموں سے موجودہ عالم حیوانات و نباتات کی گونا گونی اور بوقلمونی پیدا کر دی۔ اس اہم بات کے نظرانداز کر دینے سے دونوں فریقوں میں مخالفت بڑھی ہے۔ ورنہ کم از کم روح کا وجود دونوں میں مسلّم اور یکساں مقبول ہے۔ گویا دونوں کا اصل فرق یہ ہے کہ پہلا فرقہ آثار حیات کی مختلف صورتوں کے ابتدائی نمونوں کے یکبارگی پیدا ہو جانے پر زور دیتا ہے۔ اور فلاسفہ جدید روح کے وجود کو مان کر چند ابتدائی اجرام سے موجودہ ترقی یافتہ اجسام کی تکمیل کے لئے بہت بڑے زمانے اور لامحدود مدت کی ضرورت ثابت کرتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ ان دونوں مسئلوں کے تسمیے میں سخت غلط فہمی ہوئی ہے ایک کو مسئلۂ خلقت کائنات کہتے ہیں۔ دوسرے کو مسئلہ ارتقا کہتے ہیں۔ گویا ایک فرقہ نشو و نما کا بالکل انکار کرتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ خلقت کو مطلق نہیں مانتا۔ حالانکہ موجودہ خیالات کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ مسئلۂ خلقت والے بھی یہ مانتے ہیں کہ آثار حیات میں ایک حد تک نشو و نما کو بھی دخل ہے۔ گو زیادہ زور اسی پر دیتے ہیں کہ دنیا یکبارگی پیدا کی گئی اس کے برخلاف فلاسفہ جدید خلقت کو آفرینش عالم کے مسئلے سے خارج نہیں کرتے۔ بلکہ بحث ہی روح کے وجود کو مسلّم مان کر کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ چند ابتدائی اجرام حیات کو موجود فرض کر لیں تو پھر باقی تمام اشیا اُنھی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں ابتدائی خلقت کو ماننا ناگزیر ہے۔ ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ اصلی اختلاف طرز عمل میں ہے۔ کہ آیا یہ تمام ذی حیات اشیا اپنی اسی حالت میں اور اسی قابلیت کے ساتھ کسی توانا ذات کے حکم سے یکدم موجود ہو گئیں۔ یا صرف چند ابتدائی جاندار جرموں سے بڑھتے بڑھتے اور بدلتے بدلتے ہوئے زمین پر یہ رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔ آخر میں یہ بات بھی کہہ دینی چاہئے کہ طبقۂ علما میں ارتقا کا مسئلہ روز بروز ترقی پر ہے۔ اور طرز عمل کی بابت اس کے جوابات اور تحقیقات زیادہ تسلی بخش اور اطمینان دہ ہیں۔ کچھ دن پہلے لوگ زمین کو بھی یکبارگی پیدا شدہ

Marfat.com

مانتے تھے۔ اور اس خیال نے مدتوں تک علم طبقات الارض کی ترقی کو دبائے رکھا۔ اس کی تحقیقات کی بھی ایسی ہی مخالفت کی جاتی تھی۔ جیسے مسئلۂ دوران زمین کی۔ اس علم کو بھی میدان خیال میں قدم قدم زمین پر لڑنا پڑا۔ اور چپہ چپہ جگہ کے لئے جان لڑانی پڑی۔ آخر خدا خدا کر کے سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں ثبوتوں کے بعد اس نے منوالیا کہ طبقات زمین لاانتہا مدت میں نہایت ہی آہستہ آہستہ بنے ہیں۔ اور خود ان کی اور ان کے آثار محفورہ منحجرہ کی تاریخ اب سے کروڑہا کروڑ برس پہلے تک پھیلی ہوئی ہے۔ غرض دقّت پڑی۔ محنت اٹھائی۔ مصیبت سہی۔ خوب کشمکش رہی۔ مگر آخر شان الٰہی کے نئے نشان کے سامنے اگلے عقیدوں کو سر تسلیم جھکانا پڑا۔ اور رنگا رنگئ صنعتِ نامتناہی کی نئی نیرنگی نے پُرانے رنگ کو بیرنگ کر دیا۔

مگر یہ فتح نئی لڑائی کے لئے پیش خیمہ تھی۔ علم حیوانات و نباتات نے طبقات الارض کی تحقیقات کو لے کر یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ سطح زمین کے موجودہ درخت اور جانور زمانہ قدیم کے درختوں اور جانوروں کی ترقی کردہ صورتیں ہیں۔ اور وہ خود ان اسلاف کے اخلاف تھے جن کی پتھرائی ہوئی صورتیں زمین کے طبقوں میں سے دبی دبائی ملی تھیں۔ عقیدۂ قدیم نے اس کا مقابلہ بھی بڑی سختی اور تندی سے کیا۔ کیونکہ اس کے مطابق تمام موجودہ حیوانات و نباتات صرف چھ ہزار سال ہوئے دنیا میں آئے تھے۔ اور ان سے پہلے کوئی ان کے مشابہ چیز یہاں موجود نہ تھی۔ اور اس کے بعد ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اس پرانے عقیدے کو ہاتھ سے دینا۔ گویا دین و ایمان سے ہاتھ دھونا۔ اور دین و دنیا دونوں کو ہاتھ سے کھونا تھا۔ اس لئے گو اس کے ماننے والے شہادت نہ لاسکتے تھے مگر شہادت کے لئے تیار تھے۔ اُدھر وہ علوم بھی گڑے مردے اکھیڑ کر اپنی دلیلوں کی فوج کو دریا موج اور اپنی شہادتوں کے لشکر کو محشر حشر بنا کر آمادۂ پیکار تھے۔

آخر انہی کا پلہ وزن رہا۔ اور یکبارگی اور ناگہانی آفرینش کے دعویداروں کی چشم ثبات علوم طبعی کے ثبوت عینی کے سامنے جھک گئی۔ مگر یہ بھی بات کے پکے

اور قول کے سچّے تھے۔ میدان ہارا مگر دل نہ ہارا۔ اگرچہ مخالف دلیلوں کے پرے کے پرے انسانی دل ودماغ کے تمام درے روکے پڑے ہیں۔ مگر ان کی حد سے پرے پرے اور اُن کی زد سے باہر باہر یہ بھی برابر شبخون مارے جاتے ہیں +

مزید برآں یہ کہ انسان کو اس قاعدے سے مستثنیٰ ٹھہرایا ہے۔ یعنی اگرچہ اور جانوروں اور درختوں کو ان سے کم درجے کے قدیمی حیوانات ونباتات کی پود مان لیتے ہیں۔ مگر خود انسان کو بلاواسطہ عیینہٖ یکبارگی پیدا کردہ قرار دیتے ہیں۔ اور اب تمام زور دلائل اسی پر خرچ کیا جاتا ہے۔ نئے فرقے نے ان کو اس تنگ قلعے میں گھیرا ہے۔ مگر چونکہ خود اس کو بھی یہ خوف تھا کہ مبادا سچ مچ پرانے عقیدوں کی تردید سے اخلاقی اور تمدنی حالت میں فتور آجائے اس لئے کچھ تو اس عقیدے کی جاں بخشی کرنے کے خیال سے اور کچھ خود اپنے نوگرفتہ مقبوضات کو مضبوط کرنے کے لئے ابھی یہیں قیام ہے +

یہ حالت دونوں فریقوں کی گزشتہ صدی کے وسط میں تھی۔ بعض زیادہ تیز رو محققین نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ کوئی وجہ نہیں کہ اور جانوروں کے ساتھ انسان پر معلومہ قوانین قدرت نہ پھیلائے جائیں۔ اگرچہ اس زمانے کے بھی بعض محقق صداقت کے بہت قریب آگئے تھے۔ مگر چونکہ امتحان اور آزمائش کی کمی نے تمام واقعات ان پر ظاہر نہ کئے تھے۔ اس لئے یہ کام ان کے بعد کی نسل کے ایک نہایت پر مغز اور عالی دماغ محقق کے لئے باقی رہ گیا۔ جس نے ارتقا کے مسئلے کو مکمل کردیا۔ جو آج تمام ذیحیات اشیا کی ابتدا اور آفرینش کی طرز عمل کی تشریح وتوضیح کرتا ہے +

یہاں ہم کو اس نئے مسئلے کے تمام اصول بیان کرنے نہیں ہیں۔ بلکہ طرز آفرینش کے متعلق مختلف فرقوں کی رائیں دکھانی ہیں۔ ہاں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ نیا مسئلہ عقلاً اوروں سے بہتر و برتر ہے۔ شاید مختلف مذہبوں کے عقیدوں کی تفصیل معاملے کو زیادہ واضح کردے +

خلقت یکبارگی کے ماننے والے گو خود مختلف الآرا ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر

کا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا نیست سے ہست کی گئی ہے۔ یعنی دنیا اور مختلف اشیائے دنیا کی صورت ہی نہیں بلکہ اُن کا مادہ بھی حکم قضا سے وجود میں آیا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ مادہ موجود تھا۔ اور خلقت کا کام صرف اس مادہ کو مرتب اور متشکل کرنا تھا۔ مگر حقیقت میں یہ خیال تحقیقات جدید کا نتیجہ ہے۔ اصلی نہیں ہے۔ مسلمانوں اور مسیحیوں نے کتاب پیدائش کے ابتدائی بابوں کو لفظاً لفظاً صحیح تسلیم کیا ہے۔ ان میں خلقت کائنات کی مدت ۶ دن ٹھہرائی ہے۔ ہر دن ایک نئی چیز کی پیدائش کا دن ہے۔ اور ثوابت و سیارات کی ابتدا بھی انہی دنوں میں ہے۔ کیونکہ اسی ضمن میں مرقوم ہے کہ "خدا نے دو بڑی روشنیاں بنائیں ان میں سے بڑی نیّر بن پیدا گئے۔ بڑا دن کے لئے اور چھوٹا رات کے لئے اس نے ستارے بھی بنائے" اور اخیر میں چھٹے دن انسان کی پیدائش سے تمام کام کا اختتام ہوتا ہے۔ اصل عبرانی کتاب میں یوم کا لفظ آیا ہے۔ جس سے عموماً یہی دن مراد ہوتا ہے۔ جو عرف عام میں مشہور ہے۔ عبرانیوں کا بھی مسئلہ مسلّم چلا آتا تھا کہ یکایک علم طبقات الارض کی ترقی نے انسانی دماغ میں زلزلہ ڈال دیا۔ اور پیش پا افتادہ واقعات کے سامنے اس مذکورہ اعتقاد کو لفظاً صحیح ماننا ناممکن ہوگیا۔ اس لئے علمائے مذہب نے یوم کے معنی کھینچ تان کر ایک زمانہ درست ٹھہرائے۔ اور عبرانی زبان میں اس کی ایسی مثالیں نکالیں جہاں یہ لفظ انہی مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ اور کتاب پیدائش کے الفاظ کی اس طرح تاویل کر کے اسے ایک حد تک علوم عقلی کے مطابق کر دیا۔ مگر صرف زمین اور اجرام سماوی کے لئے کیونکہ ذیحیات مخلوق اور انسان کی پیدائش کے بارے میں عقیدوں کا دار و مدار پھر اسی کتاب پیدائش کے انہی ابتدائی بابوں پر رہا۔ جہاں بیان کیا گیا ہے کہ "خدا نے انسان کو چھٹے دن اپنی صورت پر تمام سطح بر و بحر پر حکمرانی کے لئے پیدا کیا۔ اور آدم نام رکھا" آدمؑ کے بعد حواؑ کی پیدائش کا حال بھی وہیں درج ہے۔ کہ ایک دن جب آدمؑ سو رہے تھے تو ان کی بائیں پسلی سے حضرت حواؑ کا ظہور ہوا +

یہ بیان سمیا طیقی قوموں میں بہت پرانا ہے۔ اور اس میں مادے کی پیدائش

Marfat.com

کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف صورت آدم میں روح پھونکنے کا بیان ہے۔
اس سے ملتا جلتا بیان کلدانی دفینوں ہیں سے بھی ملا ہے۔ اور بابل کے نہایت ہی پرانے کتبے بھی اس ابتدائی ہیولے کا ذکر کرتے ہیں جس سے انسان پیدا ہونے والا تھا۔ اور اس میں اور عبرانی بیان میں بڑا فرق یہ ہے کہ وہ (عبرانی) خالق کو اس ہیولے سے الگ اور اس پر حکمراں مانتے ہیں۔ جس نے اس ہیولے کو صورت دے کر اس سے رنگا رنگ کی مخلوق پیدا کی۔ باقی باتوں میں یہ بیان باہم بہت کچھ متفق ہیں۔ ایک فرق اور بھی ہے اور وہ یہ کہ عموماً کلدانی اور بابلی لوگ رب الانواع کی پرستش کرتے تھے۔ مگر عبرانی لوگ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مگر اس میں بھی ایک موافقت کا نکتہ ہے۔ اور وہ یہ کہ لفظ الوہیم یا آل اِلٰہ جو عبرانی کتابوں میں مستعمل ہے۔ حقیقت میں جمع ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ یہ جمع صرف عزت اور عظمت کے لئے ہے۔ یہ فرق بھی ہے کہ بعد میں عبرانی لوگ خدا کو خالق مادہ بھی کہنے لگے۔ اگرچہ ابتداً وہ اسے صرف خالق الاشیا سمجھتے تھے۔ مگر اہل بابل اور کلدانی خدا کو بھی مادہ کا ایک جزو اور محض اس کا صورت نگار خیال کرتے تھے۔ قدما کے عقائد میں مصریوں کا مذہب بھی سب سے پرانا ہونے کے لحاظ سے خصوصاً قابل ذکر ہے مصری بھی بہت سے دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے ہاں خالق کا نام فوٹھ تھا "جس نے دنیا کو تاریک سے منور کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی سامی نسلوں کی طرح ابتدائی ہیولے اور پریشانی کے قائل تھے۔ ایک دیوتا کا نام را تھا جسے خالق الاشیا جانتے تھے۔ سورج کا دیوتا اور جان پیدا کرنے والا وہی سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کی روزانہ حیات و ممات کا مالک پٹاہ کے نام سے موسوم تھا۔ ان کے دیوتاؤں کا مفصل ذکر خود اہل مصر کی تاریخ میں آئیگا۔ یہاں مثال کے واسطے اتنا حال کافی ہے ؎

آریا نسلوں اور سمیا طیقی خاندانوں کے اعتقادات میں کوئی مشابہت یافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آریا لوگ ابتدا ہی سے کائنات کو اور نظر سے دیکھتے تھے۔ صرف ایک مشابہت کی مثال

پائی گئی ہے۔ اور وہ قدیم ایرانیوں کے عقائد میں ہے۔ جو کتاب زند اوستا میں مذکور ہیں۔ وہاں بھی تمام اشیا کا خالق ہرمزد کو مانا ہے۔ جس کی زبان سے نکلتے ہی ہر ایک شے پیدا ہونے لگتی ہے۔ مگر کلدانیوں کی طرح ان کے نزدیک بھی مادہ پہلے سے موجود تھا۔ ہرمزد صرف صورتیں بنانے والا تھا۔ تخت رستم کے مشہور تبرکا حروف کے کتبے میں ہرمزد کی شان میں لکھا ہے۔ "وہ سب سے بڑا خداؤں کا خدا جس نے زمین و آسمان بنایا اور انسان کو پیدا کیا" یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہئے کہ زند اوستا زرتشت کے مذہب کی کتاب ہے۔ اور زرتشت خود ارمینیا کی طرف کا فلسفی تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ خیال سمیا طیقی نسلوں سے ہی لیا اور ایران میں آکر رواج دیا ہو۔ یہ کتابیں خود ایرانیوں کے ذاتی عقائد کی بابت خاموش ہیں۔ اس لئے غالباً یہ مشابہت کی مثال بھی محض خیال ہی خیال ہے +

آریا قومیں ابتدا ہی بہت سے دیوتاؤں کی قائل ہو گئی تھیں ہندوستان اور یونان میں جتنے خاندان تھے اتنے ہی معبود۔ اور ان دیوتاؤں کے جمگھٹے میں احسن الخالقین یا سب سے بڑے دیوتا کا پتہ بھی نہیں ملتا۔ یونانی رب الانواع کو پوجتے تھے۔ اور علت العلل یا خالق مطلق پر چنداں بحث نہیں کرتے تھے (جیسے آج کل اہل ہند اپنے ڈپٹیوں اور ڈپٹی کمشنروں کو نذریں دکھائیں۔ مگر شہنشاہ کا نام تک بھی نہ جانتے ہوں) اور مادے کو ہمیشہ موجود مانتے تھے۔ قدیم ہندی عقائد میں کہیں کہیں توحید کی جھلک نظر آتی ہے۔ وید کی ایک سب سے بڑی دعا کے کچھ حصے مثالاً درج کئے جاتے ہیں۔ "سب سے پہلے سنہری بچہ پیدا ہوا۔ وہ تمام موجودات کا یکتا مالک تھا۔ اس نے آسمان اور زمین کو مرتب کیا۔ وہ معبود کون ہے جس کو ہم اپنی نذر چڑھائیں؟ وہ جو اپنی طاقت سے پانی کے بادلوں کے اوپر دیکھتا ہے۔ وہ بادل جو طاقت دیتے ہیں۔ اور قربانی کو روشن کرتے ہیں۔ وہی خدا سب معبودوں پر قادر ہے۔ وہ کون معبود ہے جس کے آگے ہم اپنی قربانی دیں؟ وہ ہمیں غارت نہ کرے۔ وہ جس نے زمین کو پیدا کیا۔ یا وہ پاک معبود جس نے آسمان کو

بنایا۔ اسی نے چمکدار اور ہولناک سمندر بنایا۔ وہ کون معبود ہے جس کے آگے ہم اپنی قربانی دیں۔" ہندوؤں نے اس معبود کا نام اندر رکھا ہے۔ مگر ان کے یہاں بھی نیست سے ہست کرنے کا مسئلہ نہیں پایا جاتا۔ تمام آریا قومیں مادے کو موجود مان لیتی ہیں۔ گویا ان کے ابتدائی فلاسفہ اور حکمائے حال کے خیال کے مطابق مادے اور طاقت دو غیر فانی جزوں میں سے ایک کو تسلیم کر رکھا تھا۔ اور اس مادے کے لئے عقلمند پیدا کرنے والی طاقتوں کو مختلف معبودوں کی صورت میں ظاہر کرتے تھے۔ الغرض یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ آریا نسلیں شروع ہی سے زیادہ مادہ پرست اور ارتقا کی قائل تھیں۔ اور سمیا طبقی نسلیں عموماً زیادہ خدا پرست اور دنیا کی بیکبارگی پیدائش کی معتقد تھیں۔ عموماً تمام لوگ ان مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے اس سے زیادہ ان کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ اس لئے دوسرے اور نو پیدا شدہ مسئلے کی طرف چلنا چاہیئے +

علوم طبیعی کی ترقی اور طبقات ارض کی بناوٹ کے علم کے بعد ان مسئلوں میں شک و شبہے پیدا ہونے لگے اور تحقیقات کے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی بڑھتا گیا کہ قوانین قدرت اپنے کام میں بالکل یکساں رہے ہیں۔ اور دنیا کی اشیا ہمیشہ سے اسی طرح پیدا ہوتی اور نشو و نما پاتی چلی آئی ہیں۔ اور کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی۔ جس سے ان قوانین میں کوئی رخنہ پڑے۔ یا ان چیزوں کی پیدائش میں کوئی استثنا ہو۔ یہ خیالات اسی طرح پیدا ہوتے اور بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مختلف لوگوں کی مختلف کوششوں کے بعد آخر انیسویں صدی کے وسط میں رابرٹ چارلس ڈاروِن نے ارتقا کے مسئلے کو مکمل اور مرتب کر دیا۔ اور مغربی قوموں میں پہلے طبقہ علما اور پھر رفتہ رفتہ عوام الناس تک اس بات کو ماننے لگے کہ آج کل کے طرح طرح کے مکمل زندہ اجسام انتخاب قدرت اور انقائے بہتر بن کے ذریعے سے صرف چند ابتدائی اور سادہ جرموں کے ارتقا اور باہمی تغیر و تبدل کا نتیجہ ہیں۔ اس مسئلے کی ترقی اور کامیابی خود انسانی دماغ کے ارتقا کی ایک مثال

Marfat.com

ہے۔ چونکہ مسئلہ نہایت اہم اور عجیب ہے۔ اور ناظرین اس سے چنداں واقف بھی نہیں ہیں۔ اس لئے کچھ تفصیل نازیبا نہیں ہے +

یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے۔ ارسطو بھی اسے استعمال کرتا ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہر زمین اور ہر زماں میں مختلف فلاسفہ اس کے دلدادہ رہے ہیں۔ مشہور عالم تشریح ہاروے (۱۶۵۷-۱۵۷۸) جس نے دورانِ خون کا مسئلہ دریافت کیا تھا۔ اس بات کا قائل تھا کہ اعلیٰ طبقۂ حیوانات کے نئے عضو و جوارح یکایک اس حصہ بدن پر بڑھ جانے یا اس جانور کے جسم کے پھیل جانے سے پیدا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ کسی ذرا سے بقیے کے تغیر و تبدل اور ضرورت استعمال کی وجہ سے نشو و نما پانے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اور بہت سے محققین اس پر غور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ڈارون اور ولیس نے اس کو پورا رواج دے دیا۔ اور اب یہ مسئلہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ اہل مغرب میں سے ہر ایک پڑھا لکھا شخص اس سے واقف و آگاہ ہے۔ اور علمائے تشریح الانسان نے تو اپنی تمام تعلیم کی بنیاد ہی اسی پر رکھی ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ یہ مسئلہ جانداروں کی پیدائش اور انکی دگرگونی کی نہایت پسندیدہ توضیح کرتا ہے +

باب یازدہم

نئے مسئلے کی ابتدا

مسئلہ ارتقا کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان چند باتوں کو پہلے ہی بیان کر دینا ضروری ہے۔ جو اس کی تعلیم کا جزو نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے مخالفوں نے اسے بدنام کرنے کے لئے اس کے سر لگا دی ہیں۔ اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی بہت ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اس مسئلے میں بہت

Marfat.com

غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ لوگ اس کو شروع سے ہی نہایت گمراہ کن سمجھنے لگے۔
اور بہتوں کو یہ خیال ہوگیا کہ یہ مسئلہ کسی بد باطن شخص نے عمداً و قصداً انسان
کی موجودہ دماغی اور اخلاقی حالت کو مذبذب اور متزلزل کرنے کے لئے گھڑا
ہے۔ دماغ انسانی کی ترقی کی تاریخ میں یہ بات قابل افسوس ہے کہ جس کسی
نے اس کو ترقی دینے کے لئے پرانے خیالات سے خلاف ورزی یا مسلم
عقائد میں نکتہ چینی کی۔ سب لوگ اسی کی دشمنی پر آمادہ ہوگئے من صنف فقد استہدف
پرانا قول ہے اور بہت درست۔ یہ بجا ہے کہ اس مسئلے سے آفرینش انسان سے
قدیم عقائد میں خلل پڑا۔ مگر ویسے یہ مسئلہ نہایت ہی حلیم اور نرم پیرائے میں
ظاہر کیا گیا تھا۔ اور اس کا مدعا صرف ایک قسم کی نئی تحقیقات کو لوگوں کے سامنے
پیش کرنا تھا۔ کسی خاص فرقے سے لڑائی مول لینا نہیں تھا۔ عقائد مذہبی یا
علم الٰہیات کی بحث سے اس کو کچھ علاقہ ہی نہیں۔ اس کا کام صرف قدرتی
واقعات پر غور کرکے ان سے طبیعی نتائج اخذ کرنا ہے۔ اور اس کی خوبی یہ
ہے کہ یہ دنیا کی تمام ذیحیات اشیا کی پیدائش اور نشو و نما کو ایک قانون کے ماتحت
ہیں یعنی وہ کہ بظاہر مختلف اور مخالف واقعات کو منتظم اور مرتب کر دیتا ہے۔ اب
ہم ان غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مدتوں تک ساری دنیا کو اس
کے خون کا پیاسا بنائے رکھا۔ اور اب بھی اس کے دبانے میں اپنا کام کر رہی
ہیں۔ اوّل اور سب سے بڑی غلط فہمی عوام کا یہ خیال ہے کہ یہ مسئلہ ابتدائے روح
کے حل کرنے کا مدعی ہے۔ اور عالم امکان کے تمام موجودہ آثار حیات کی تشریح
معلومہ قوانین قدرت کے مطابق کرکے زندگی کو محض مادی قرار دیتا ہے۔ یہ خیال
بالکل غلط اور محض بہتان ہے۔ اگرچہ بعض نہایت ادنےٰ درجہ کے کیڑوں میں
زندگی کے خود بخود پیدا ہو جانے کا شبہ ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک تمام تحقیقات سے
یہی نتیجہ نکلا ہے کہ جان کی ابتدا جان ہی سے ہوتی ہے مسئلہ ارتقا روح
کو موجود تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کے بعد جاندارروں کے ظاہری اختلاف اور گوناگونی
کو عقل کے مطابق سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق صرف ان چیزوں
سے ہے جو جان اور جسم کے ملنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر اس کو اس سے مطلب

Marfat.com

نہیں کہ یہ دونوں چیزیں خود کیونکر پیدا ہوئیں اور کہاں سے آئیں۔ یا ان کی غرض کیا ہوگی اور یہ کہاں جائینگی؟ علم الغایات کی بحث اس سے الگ ہے۔ مختصراً یہ کہ علت العلل سے اسے مطلق سروکار نہیں۔ اور واجب الوجود کی ہستی سے اسے کچھ بھی انکار نہیں۔ اسی لئے حقیقت میں عوام الناس کے اصلی عقائد پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ یہ غلط فہمی کچھ نافہمی سے اور کچھ جان بوجھکر اس کی دشمنی سے پھیلائی گئی ہے۔ (امید ہے کہ ہمارے ناظرین اس کو اچھی طرح ذہن نشین رکھکر اس قسم کی غلط فہمی سے بچ جائینگے) اور اگر اس بات پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو غالباً فریقین کی دشمنی بالکل مٹ جائے ورنہ کم تو ضرور ہی ہو جائے۔ اور حال میں ایسا ہؤا بھی ہے۔ اگرچہ ایک لحاظ سے نیا فرقہ اپنی روزافزوں فتوحات پر ناز کرنے کا مجاز ہے۔ مگر دوسری حیثیت سے پرانا عقیدہ اب تک بھی بزرگی کا بجا دعوےٰ کر سکتا ہے۔ کیونکہ سائنس روح کی بابت کچھ بھی نہیں جانتی۔ اور ذات واجب الوجود اور ہستی روح جیسی دو نہایت ہی ضروری اور اہم چیزوں کے لئے علوم طبعیات عقائد مذہبی کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ حالانکہ یہی دونوں چیزیں تمام کائنات کی جان اور تمام مخلوقات کی روح رواں ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو سائنس اور سائنس کی مبحوث فیہ چیزوں کا نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ یہی ہیں۔ جو فطرت کے تمام آئین کی بانی اور قدرت کے سارے قوانین سے بالا ہیں +

دوسری غلط فہمی جو اس کی قبولیت میں حائل ہوئی ہے یہ ہے کہ عوام نے سمجھا کہ یہ مسئلہ انسان کو ادنےٰ اور دوسری قسم کے جانوروں کی نسل بناتا ہے۔ ڈارون اور ویلس کی تحریرات کے بہت دن بعد تک یہی خیال عام رہا کہ ان لوگوں کے نزدیک آدمی بندروں اور لنگوروں کی اولاد ہیں۔ ابنائے عصر کی نازک دماغی اس کا اتنا تحمل نہ کر سکی کہ اس بات پر تامل تو کرتی۔ اور بے دیکھے بھالے یہ مسئلہ حقارت سے رد کر دیا گیا۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ یہ قول مسئلہ ارتقا سے مختلف ہی نہیں ہے۔ بلکہ بالکل اس کے

Marfat.com

مخالف ہے۔ مگر "آفریں دل کو مرے یہ جو ڈٹا سو ڈٹا" کسی حریف کی زبان سے نکلنا تھا کہ لوگوں کے دلوں پر پتھر کی لکیر ہو گیا۔ اور دل لگی بازوں کو ایک کرشمہ ہاتھ آیا۔ یہ سچ ہے کہ اس مسئلے کے مطابق انسان کم درجے کے جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور وہ جاندار خود اپنے سے کم درجے کے جانداروں کے نشوونما یافتہ نمونے تھے۔ وعلےٰ ہذا القیاس۔ مگر یہ جاندار تھے انسان کی ہی قسم کے۔ غیر قسم کے ہرگز نہ تھے۔ اسی طرح سے بندر وغیرہ تمام مختلف جانور اور درخت پہلے زیادہ سادہ اور کم درجے کے تھے۔ جن کے پتھرائے ہوئے نمونے ہماری تعلیم کے لئے اب تک زمین کے طبقوں میں امانت رکھے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن ایک الگ قسم کے جانوروں سے دوسری علیحدہ قسم کا پیدا ہو جانا اس مسئلے کی بالکل ضد ہے۔ اور اس کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے ان دونوں صورتوں میں پورا امتیاز کرنا لازمی ہے۔ مسئلہ ارتقا کا یہ اصول کہ حیوانات نقل مکان کرنے کے بعد اپنے ابنائے وطن کی صورت سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو بالکل ناممکن قرار دیتا ہے کہ ان جانوروں کے توالد و تناسل سے جو پہلے ہی مختلف ہیں ایک نئی اور اعلےٰ قسم کے جانور پیدا ہو جائیں۔ فی الواقع سب جانتے ہیں کہ قدرت نے دوغلوں کو بانجھ اور عقیم بنا کر ہمیشہ کے لئے اس قسم کے توالد و تناسل کو روک دیا ہے۔ اور ایک سے دوسری قسم کے جانوروں کے پیدا ہونے کو دائمی طور پر ناممکن کر دیا ہے +

یہ اصول بہت عام ہے۔ صرف مسئلہ ارتقا ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ مثلاً علم الالسنہ ہی کو لیجئے۔ اس میں بھی مدتوں تک یہی غلط فہمی رہی علما تک یہی سمجھتے رہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے نکلی ہے۔ برسوں تک یہی کہا گیا کہ لاطینی یونانی سے نکلی ہے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ لاطینی اور یونانی دونوں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ کبھی سمجھتے تھے کہ عربی عبرانی کی شاخ ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ عبرانی کلدانی سے ماخوذ ہے۔ غرض تمام سلسلہ اور ساری بحث کو خلط ملط اور گڈمڈ کر رکھا تھا۔ لیکن یہ کسی فلسفی کو خیال نہ آتا تھا کہ ممکن

ہے کہ کوئی تاریخی زمانے سے پہلے کی زبان ہو جس سے تمام آریائی زبانیں آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے اس قدر مختلف ہو کر موجودہ صورتوں میں آگئی ہوں بہرحال آخرکار یہ خیال آیا اور علم الالسنہ کی صحیح اور مضبوط بنیاد پڑی۔ اب مبتدی بھی جانتے ہیں کہ کوئی زبان کسی موجودہ زبان سے نہیں نکلی۔ بلکہ سب آپس میں چھوٹے بڑے بھائی بہن ہیں۔ جو آخر میں جا کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے ماخوذ ہونا ناممکن ہے +

بعینہٖ یہی کیفیت مسئلہ ارتقا کی ہے۔ عوام ہی نہیں بلکہ علما تک بھی اسی غلطی میں پڑ گئے تھے۔ جن کی بڑی مشکل سے اصلاح ہو سکی۔ اس مسئلے کی بحث کے متعلق سینکڑوں کتابیں ہیں کہ ہر ایک کے صفحے انہیں مذکورہ دونوں غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں ہم پھر ایک دفعہ تاکید کرتے ہیں کہ مسئلہ ارتقا روح کے وجود کو مان کر اپنی بحث شروع کرتا ہے۔ اور مختلف قسم کے جانوروں کے توالد و تناسل سے نئی قسموں کے پیدا ہو جانے سے بالکل انکار کرتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو خارج کر کے اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ مسئلہ کہتا کیا ہے؟ مگر اس تشریح سے پہلے اگر ہم اس کی ابتدا کے زمانے کے حالات اور خیالات کا مختصر سا ذکر کر دیں تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ ارتقا کا مسئلہ خود انسانی خیالات کے ارتقا کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی توضیح کے لئے اس سے پہلے کے حالات جن سے یہ پیدا ہوا ہے لکھنے ضروری ہیں +

قانون قدرت طرز عمل کے اس نئے مسئلے کے دریافت کرنے والوں کو ان کے پیدا ہونے سے مدتوں پہلے اس کام کے قابل بنا رہے تھے۔ آخر وقت آگیا کہ پرانے عقائد نے خیالات کو جگہ دیں۔ سب سے پہلے ڈسکارٹیز نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مادی دنیا کی جاندار اور بے جان اشیا کل کے پرزوں کی کی طرح مختلف قاعدوں کی پابند ہیں۔ اور ان قاعدوں کے جان لینے سے نظام کائنات سمجھ میں آسکتا ہے۔ تاریکی اور جہالت کا زمانہ ختم ہو ہی چکا تھا۔ خوردبین کی ایجاد اور زیادہ گہرے کیمیائی امتحانوں سے جانوروں کے جسم کی

Marfat.com

ساخت اور رگ پٹھوں کی بناوٹ پر زیادہ روشنی پڑی۔ اور ان سے یہ معلوم ہؤا کہ ہر جاندار کے اپنے ابتدائی جرم یا بیج سے انتہائی جسم تک ترقی کرنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ جب اس داستان کی چھان بین ہوئی تو یہ معلوم ہؤا کہ ہر درخت اور ہر جانور کی زندگی کی داستان بالکل یکساں ہے۔ اس تحقیق سے ان عظیم الشان اور وسیع قانونوں کا نشان ملا۔ جن کا پہلے سان گمان بھی نہ تھا۔ تحقیقات کرتے کرتے یہ بھی پتہ لگا کہ فرد اور نوع کی زندگی میں بھی ایک گونہ لگاؤ اور مشابہت ہے۔ غرض یہ بات ایک حاوی قانون کا سراغ دیتی تھی۔ اس کے بعد یہ دریافت ہؤا کہ نہایت ہی مختلف طبیعتوں اور ناموافق عادتوں کے حیوانات میں بھی جسم کا ڈھانچہ اور نظام بالکل ایک ہی ڈھنگ کا ہے۔ اور جو کچھ فرق ہے بھی وہ ایسا ہے کہ اس کا محض اختلاف عادات اور انقلاب حالات سے پیدا ہو جانا ممکن ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض جانوروں کے جسموں میں ایسے حصے یا عضو ہیں جو ان کی موجودہ حالت میں غیر ضروری اور بیکار ہیں۔ اور اسی لئے گھٹ گھٹ کر محض برائے نام رہ گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک زمانہ تھا جب یہ جانور اس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جس میں وہ خاص عضو کارآمد تھا۔ یہ بھی آزمایا گیا کہ جانوروں کی عادتیں یا ان کے رہنے کی جگہ بدل دینے سے ان کی صورت بھی بدلنے لگتی ہے۔ اور آخرالامر ان مختلف تجربوں کی اثنا میں علم طبقات الارض۔ نے آثار محفورۂ متحجرّہ کی جماعت بندی کا کام مکمل کر کے ان کو بالکل مرتّب کر دیا۔ جس سے ایک اعلےٰ قسم کے جانوروں کا اسی قسم کے زیادہ سادہ ساخت اور ادنےٰ درجے کے جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہونا عملاً ثابت ہو گیا۔ اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ دنیا میں آثار حیات کی تاریخی زمانے سے پہلے کی تاریخ انقلاب۔ تغیر و تبدل اور ارتقا کی ایک داستان تھی +

یہ سب اصول و مسائل تمام اٹھارویں صدی میں متحقّق ہوتے رہے۔ اور آخر انیسویں صدی کے وسط میں ان پر اتنا کافی غور و خوض ہو چکا تھا۔ کہ ان سے عام اور حاوی قانون نکالنا ممکن بلکہ واجب اور مناسب معلوم ہؤا

علم تشریح اور علم الابدان کے متعلق قدما کی ناواقفیت تعجب انگیز ہے۔ زمانۂ قدیم کے بڑے بڑے فلاسفہ اور حکما بھی جسم انسان کی ساخت سے محض ناآشنا تھے۔ اگرچہ یہ جسم ہی تمام قوائے باطنی کا مرکز اور تمام حواس ظاہری کا ماخذ ہے۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ تمام اشیائے کائنات میں سب سے پہلے اسی ضروری اور کام کی چیز کی چھان بین کی جائے۔ یونان کے حکما اور علما۔ روما کے مدبّر اور مقنّن۔ علم ہیئت کے بانی بوڑھے کلدانی۔ اور توریت اور زبور لانے والے بنی اسرائیل کے بزرگ۔ وہ پرانے شاعر جو ویدوں کے بھجن گایا کرتے تھے۔ وہ قدیم پجاری جو اوسرس اور اسس کے اسرار بتایا کرتے تھے سب کے سب جسم حیوانی کے نہایت سیدھے سادے انتظام سے بھی ناواقف تھے۔ انسان کا جسم ایک راز تھا۔ اور اس کی بابت اکثر رائیں خام تھیں اور بعض سراپا غلط +

قدما کی اس ناواقفیّت کا بھید سمجھ میں نہیں آتا۔ نہایت معمولی حادثوں اور انقلابوں سے وہ لوگ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ باوجود اپنے اتنے علم و فضل کے بھی ہمارے بزرگ ہضم غذا یا دوران خون جیسی معمولی بات سے بھی آگاہ نہ تھے۔ یہ تاریکی قرون وُسطےٰ میں بھی بحال رہی۔ بلکہ بیہودہ توہّمات اور جاہلانہ ضعیف الاعتقادی "سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوُا"۔ چونکہ یہ اہم مسئلہ ارتقا جو تمام دنیا کے اختلاف انواع و اقسام اور تمام حیوانات کی گوناگونی اور بوقلمونی کے اسباب و بواعث بیان کرنیکا دعوےٰ رکھتا ہے۔ اصل میں ان انقلابات کو دیکھکر وضع کیا گیا ہے جو ہر ایک جاندار چیز کی ابتدا سے انتہا تک پائے جاتے ہیں۔ اس لئے توضیح کے واسطے ہم زندگی حیوان کی مختصر کیفیّت بیان کرتے ہیں +

ہر ایک ذیحیات چیز ایک نہایت ہی چھوٹے سے مادی ذرے سے بنتی ہے۔ سائنس کی باریک سے باریک آزمائش اور نازک سے نازک امتحان بھی اس ذرے اور آیندہ بننے والی چیز میں کوئی مشابہت یا لگاؤ تک نہیں پاتے۔ یہ زندہ ذرہ جو نشو و نما پانے سے ایک نہایت ہی پیچیدہ

Marfat.com

جسم بننے والا ہے جرم کہلاتا ہے۔ اور اپنی ابتدائی حالت میں زندہ مادے کا محض ایک ذرا سا بیج ہوتا ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے اور آخر میں ایک خاص جیتا جاگتا جسم بن جانے کی پوشیدہ قابلیت ودیعت رکھی گئی ہے۔ حقیقت میں یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ جرم زندہ بھی ہوتا ہے یا نہیں شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اس میں حیات کی بھی صرف قابلیت ہے۔ واقع میں جاندار نہیں ہے۔ بہر حال جرم اور محض بے جان مادے کے ایک بیج میں عمدہ سے عمدہ خوردبین۔ اور نازک سے نازک کیمیائی امتحان بھی کوئی فرق نہیں دکھا سکتے۔ شاید یہ رائے زیادہ صحیح ہو کہ ہر جرم جو نشو و نما کی قابلیت رکھتا ہے۔ وہ خود کسی نشو و نما یافتہ جاندار چیز کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "جان جان سے ہی پیدا ہوتی ہے" کیونکہ جب تک یہ ایک صفت نہ ہو تب تک مادے کا کوئی بیج جرم سے خواہ کتنا ہی مشابہ کیوں نہ ہو۔ نشو و نما نہیں پا سکتا ✤

سائنس نے بہت سی مختلف چیزوں کے اجرام کی بڑے غور سے آزمائش کی ہے۔ اور ان کی ماہیت کو نہایت احتیاط سے دریافت کیا ہے۔ زندہ بیج ایک کیمیائی مرکب سے پر ہوتا ہے۔ جسے پروٹین کہتے ہیں کیمیائی امتحان کرنے پر اس میں آکسیجن ہائڈروجن۔ کاربن اور نائٹروجن کے اجزا اور ذرا ذرا سی گندھک اور فاسفورس بہت سے پانی میں تیرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ مرکب صرف جاندار اشیا میں ہی پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ان سے الگ نہیں ملتا۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ "اَلْحَیَاتُ بِالْحَیَات جان جان سے پیدا ہوتی ہے"۔ بہر حال یہ ہے وہ جرم جس سے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے جانوروں کی ہستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اس کے آگے اس جانور کی پیدائش کی داستاں طرح طرح کے عملوں رنگ رنگ کی تبدیلیوں اور وضع وضع کے انقلابوں کی یا یوں کہیئے کہ ارتقا کی داستان ہے۔ سب سے پہلی تبدیلی محض بڑھنا ہے۔ جرم کی جسامت بڑھنے لگتی ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کی پہلی علامت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

مادے کا ذرہ حقیقت میں جرم ہے۔ یہ بڑھنے کی طاقت بھی جرم کی ذاتی ہوتی ہے۔ خیر کچھ عرصے تک یہ بڑھنا یکساں جاری رہتا ہے۔ یعنی جسامت کے سوا اور کسی کیفیت میں فرق نہیں آتا۔ ترقی کا دوسرا زینہ یہ ہے کہ اس بیج کے بیچوں بیچ میں ایک طرح کی تناوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے اس کی تقسیم سی ہونے لگتی ہے۔ اور آخر میں ایک کی جگہ دو بیج پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ تقسیم کامل نہیں ہوتی اس لئے دونوں بیج الگ الگ نہیں ہوتے (جیسے کوئی ربڑ کے پھکنے کو بیچ میں سے ڈھیلے ڈورے سے باندھ دے اور پھر پھلائے تو بعینہٖ یہی کیفیت پیدا ہوگی) یہ دونوں نو پیدا شدہ ٹکڑے اصل بیج کی صورت اور حالت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بالکل الگ الگ نہ ہونے کی وجہ سے درمیانی مادہ دونوں میں مشترک رہتا ہے۔ آخر ان دونوں پر پھر وہی حالت طاری ہوتی ہے۔ جو اصل بیج پر ہوئی تھی۔ دونوں کے بیچ میں تناوٹ ہوتی ہے۔ اور اسی قسم کی ادھوری تقسیم سے دو ٹکڑوں کے چار ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر چار کے آٹھ اور آٹھ کے سولہ۔ وعلےٰ ہذا القیاس مگر ان میں سے ہر ایک ٹکڑا ہر طرح اپنے اصل بیج کی تمام کیفیات قائم رکھتا ہے۔ آخر اس سے مکمل بیج بن جاتا ہے۔ جو ابتدائی جرم اور انتہائی جسم کے درمیان میں پہلا زینہ ہے +

یہاں خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جرم بڑھتا کیونکر ہے۔ اور اس زیادتیٔ حجم کا مادہ کہاں سے آتا ہے یقیناً عالم نیستی سے تو نہیں آتا۔ بیج میں خوراک لینے کی طاقت ہے۔ اس کے جاندار ہونے کا مطلب ہی یہی ہے۔ یہ اپنی خوراک کو کھینچتا اور جذب کرتا ہے۔ اور اسی سے بڑھتا اور پھیلتا پھلتا ہے۔ لیکن یہ خوراک خود اس کے اجزا میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ہضم ہو کر ان کا جزو بن جاتی ہے +

ترقی کا تیسرا زینہ یہ ہے کہ یہ مکمل بیج مختلف تبدیلیوں کے بعد مضغہ (Gastrula) بن جاتا ہے یہ تبدیلیاں بالکل عام فہم نہیں ہیں۔ اور کتب تشریح میں عام طور پر مذکور ہیں۔ اس لئے ان کی پیچیدگیوں میں پڑنے کی ضرورت

Marfat.com

نہیں۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اس مضغے کی پیدائش کے بعد آیندہ ہونے والے جسم کے مختلف اعضا مثلاً بیرونی جلد۔ گوشت پوست اور رگیں وغیرہ بننی شروع ہوجاتی ہیں۔ خورش یا تو ماں کے جسم سے۔ یا آس پاس کے مناسب مادّوں سے اخذ کی جاتی ہے۔ جسامت بڑھتی جاتی ہے۔ اور آخر مختلف مدارج کے بعد جنین آئندہ بننے والے جانور کی مکمل صورت اختیار کرلیتا ہے۔ اور بیرونی دنیا میں آنے کے لائق ہوجاتا ہے۔ اس کی بھی کئی صورتیں ہیں بعض جانور انڈے دیتے ہیں۔ جن کو مناسب جگہ رکھ کر حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ یہ حرارت عموماً ماں باپ کے جسم سے لی جاتی ہے یا قدرتی اسباب اسے بہم پہنچاتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے بعد اوپر کا چھلکا پھٹ جاتا ہے۔ اور نیا جانور نئی دنیا میں آجاتا ہے۔ بچہ جننے والے جانوروں میں یہ تمام ترقی ماں کے رحم ہی میں مکمل ہوتی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد بچہ اپنی ہستی کے ابتدائی زینے پر پہنچ کر ماں کے پیٹ سے الگ اور آزاد ہوجاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے متعلق یہ تمام باتیں اتنی عام اور معمولی ہیں کہ اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اور ان کی تحقیق بھی کچھ ایسی بالکل نئی نہیں ہے۔ لیکن یہ نئی تحقیق ہے کہ تمام مختلف جانوروں میں جنینی کیفیت کے تغیر و تبدل واقع میں یکساں ہیں۔ تمام ذی حیات اشیا کے اجرام کی ابتدائی نشوونما ایک ہی طرز کی ہے۔ اور اسفنج سے لیکر اشرف الحیوانات انسان تک ابتدائی جرم اور انتہائی جسم کے تمام مدارج انقلاب ایک ہی قسم کے ہیں۔ مسئلہ ارتقا کو افراد سے انواع پر منتقل کرنے اور پھر رفتہ رفتہ تمام اشیائے کائنات پر حاوی کردینے میں یہ تحقیقات بہلا زینہ ہے۔ دوسرا زینہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے اور وہ اس تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ مختلف قسم اور مختلف طرح کے حیوانات کی جرمی اور جنینی زندگی کے انقلاب ہی یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی جسمانی ساخت بھی اصل میں ایک ہی وضع کی ہے۔ اور جو کچھ فرق ہے۔ وہ صرف مختلف عادتوں کے اختیار کرلینے یا جدا جدا حالتوں میں رہنے سہنے سے پیدا ہوگیا ہے۔ ظاہرا مختلف قسم کے جانوروں کی بناوٹ میں بڑا بھاری

فرق نظر آتا ہے۔ اور مذکورہ مسئلہ لچر اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کے باہمی اختلاف یا اتفاق کا معیار محض بینائی یا لمس کو قرار دیا ہے۔ جب تک نئے ایجاد کردہ آلات کی مدد سے سائنس کے اصول کے مطابق اس کا امتحان نہ کیا جائے۔ تب تک ان قدرتی قوانین کے اصل اصول کا پتہ لگنا آسان نہیں ہے۔ دیکھنے میں تو فی الواقع مچھلی کو کبوتر سے اور کبوتر کو اونٹ سے کچھ لگاؤ نہیں ہے۔ مگر سائنس کے اصول تحقیقات کے مطابق دیکھیں تو ان مختلف طبقوں کی بناوٹ میں مشابہت بڑھنے لگتی ہے اور مخالفت گھٹنے لگتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرق محض سطحی اور ظاہری بلکہ گمراہ کن ہیں۔ اور مشابہتیں اصلی اور حقیقی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ناواقف آدمی اس مسئلے پر ضرور تعجب کرینگے کہ کس قسم کی تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی۔ مگر ہم علم تشریح کی طرف اشارہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ زیادہ تفصیل موجب تطویل ہے۔ تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کے ڈھانچے ہمصورت ہیں۔ اور پھر یہ صورت اور قسم کے جانوروں کے ڈھانچے کے مشابہ ہے۔ اسی طرح جہانتک تحقیقات کو پھیلاتے جائیں۔ یکسانیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ تمام جاندار چیزیں ایک ہی طرح کی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور محقق کو حیران کر دیتی ہیں۔ گویا قدرت کے کارخانۂ امکان میں ایک کے سوا اور کوئی نمونہ ہی نہیں تھا ؎

ندارد راز وحدت اختلافے درمیاں اینجا ۔ بود یکحرف ہمچون بوئے گل ہر صد زبان اینجا

ببیں کہ قالب چندیں ہزار خشت یکیست ۔ مبیں بکثرت صورت کہ گم کنی معنے

کہ خاصیت یکے باشد بچندیں جرو بیچوں را ۔ گواہی میدہد عالم بوحدت ذات بیچوں را

علم تشریح کے ان مسائل کا جو اثر دل پر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم کو افراد کے ابتدائی جرم سے انتہائی جسم تک کے تمام حالات و انقلابات ایک اشارہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام مختلف قسم کے جانوروں میں یہ کیفیات یکساں ہیں۔ اور زندگی کی ادنےٰ سے ادنےٰ امثال سے لیکر اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے تک ان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اس سے آگے علم تشریح کی تحقیقات نے مختلف سے

Marfat.com

مختلف صورت اور مخالف سے مخالف عادت کے جانوروں کی جسمانی ساخت کو ہم صورت قرار دیا۔ ان باتوں سے یقینی طور پر ابتداءً تمام قسم کے حیوانات کی موافقت اور مشابہت کا پتہ ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اور نئی تحقیقات نے اس یکسانیت کے مسئلے کو اور بھی حاوی اور محیط کرنا چاہا ہے۔ سپیکٹروسکوپ یا مقیاس الاشعہ کے ذریعے سے نظام شمسی کے سیاروں کے علاوہ اور ثوابت کے اجزا بھی دریافت کئے گئے ہیں اور یہاں بھی انسان کی توقع کے خلاف جواب ملا ہے۔ انسانی طبیعت کائنات میں گوناگونی۔ رنگارنگی اور نوبیت ڈھونڈھتی تھی (اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے) مگر دیکھا تو مخالفت کی جگہ موافقت نظر آئی۔ رنگارنگی کی بجائے یکرنگی دکھائی دی نوبیت کے عوض یکسانیت معلوم ہوئی۔ اور کثرت کے بدلے وحدت ملی سیاروں میں اور ستاروں میں۔ نزدیک اور دور۔ یہاں اور وہاں۔ جہاں جہاں دیکھا وہی ہائڈروجن اور آکسیجن۔ کیلسیم اور سوڈیم سے ہی سابقہ پڑا۔ نشوونما شباب و شیب۔ حیات و ممات۔ نسخ و مسخ۔ غرض کل نظم و نسق یہاں ہے۔ وہ وہاں ہے۔ جو وہاں ہے وہ یہاں ہے +

اسی طرح علم کیمیا کی ترقی بھی اسی طرف مائل ہے۔ نئی نے پرانی کو داخل دفتر کردیا ہے۔ اور اس کا سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ پہلے کے بہت سے عنصر مرکب معلوم ہوئے اور ساٹھ ستر عنصروں کی بجائے صرف ۴۔ ۵ قسم کے خاص حرکات یا احساسات قرار دئے گئے۔ اور قیاس غالب ہے کہ چند دنوں میں اس میں بھی وحدت تک نوبت پہنچیگی۔ یہ مسئلہ کہ تمام دنیا کا "احساس کا دائمی امکان" یعنی مادہ حقیقت میں ایک ہی یا زیادہ سے زیادہ چند اجزا سے بنا ہوا ہے۔ توحید یا یکسانیت کے خیال پر بڑا زور دیتا ہے۔ اور اس کا یہ اثر مادی دنیا تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ ذیحیات اشیا پر بھی کارگر ہے +

یہ کیفیت تھی سائنس کی تحقیقات کی جب ارتقا کا مسئلہ شائع کیا گیا۔ مگر خود اس کا مدار تجربے اور مشاہدے پر تھا۔ ڈارون سیاح اور واقعات قدرتی پر غور کرنے والا تھا۔ اس نے یہ بات اپنے دادا سے ورثے میں پائی تھی ۱۸۵۹ء

میں اس نے اپنی کتاب "نسب انسان" شائع کی۔ جس میں یہ مسئلہ پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ اور معلومہ واقعات اور مشاہدے سے اس کو ثابت کیا تھا۔ ڈارون نے حیوانات اور نباتات کی مختلف کیفیتوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کے نتائج ادنےٰ درجے کے حیوانات سے بلند ہوتے ہوتے اعلےٰ طبقہ اور آخر انسان تک پہنچکر تمام جاندار اشیا کو ایک قانون کے رشتے میں منسلک اور منتظم کرتے تھے +

باب دوازدہم

مسئلۂ ارتقا

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ اس کا پہلا خیال یہ ہے کہ حیوانات کے تمام اعلےٰ طبقے جن میں انسان بھی شامل ہے۔ اس پرانے ادنےٰ اور نایاب درجے کے جانوروں کے ترقی یافتہ اور بہترین نمونے ہیں جو کشاکش ہستی میں ان کا مقابلہ نہ کرسکے اور معدوم ہوگئے۔ ڈارون نے اس کا نام انتخاب قدرتی رکھا ہے۔ جب وہ پالتو جانوروں کی خوبو پر غور کر رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ ان کے رکھوالے توالد و تناسل کے لئے سب سے اچھے جانوروں کو چھانٹ لیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ نسل میں اس چنی ہوئی نسل کے بچوں کی تعداد باقیوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان میں وہ خوبیاں جو اس انتخاب کا باعث تھیں۔ اور بھی زیادہ نمایاں اور مستحکم ہو جاتی ہیں۔ اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہیں۔ پالتو جانوروں کی اکثر قسمیں اسی عاقلانہ انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ اس مشاہدے سے ڈارون نے انتخاب کا خیال اور لفظ حاصل کیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ آیا وحشی جانور بھی جو انسان کے اس عاقلانہ انتخاب کے زیر اثر نہیں ہیں اس پر کاربند ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کی تحقیق کے لئے ڈارون نے قدرت

کے وسیع جنگلوں میں اپنے مشاہدے شروع کئے اور آخر دیکھتے دیکھتے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہاں بھی انتخاب کا قانون اسی طرح کارگر ہے۔ اور تمام جانوروں کی موجودہ قسموں کی صورت و سیرت زیادہ تر اسی سے متاثر ہوتی ہے۔ یوں اس نے دیکھا کہ دنیا میں ایک قدرتی انتخاب پایا جاتا ہے۔ جس سے ہر قسم کے زندہ جانوروں میں سے بہترین نمونے لے کر باقی چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اور ان کی خوبی کا معیار ان کی آس پاس کی کیفیات ہیں۔ یعنے ہر زندہ جسم کو اس کی طاقتیں کم و بیش قدرۃً دنیا میں رہنے کے لائق بناتی ہیں۔ ہر جانور کو اس کے قوے اور اعضا ایک خاص حد تک اس کو سامان خورش بہم پہنچانے کی قابلیت دیتے ہیں اور ہر جاندار میں قدرۃً دنیا میں رہنے کی طاقتیں۔ سامان خورش مہیا کرنے کی لیاقتیں اور آرام اور فائدے اور دیگر طبعی خواہشات اور فطری جذبات کی خاطر خواہ تکمیل کے پھیلاؤ ان میدان میں جمنے کی قابلیتیں کم و بیش اور مختلف درجے کی ہوتی ہیں۔ پس جن میں کسی وجہ سے یہ باتیں زیادہ ہوتی ہیں وہ کشاکش زندگی کے معرکے میں جیت جاتے ہیں۔ اور انہی کے کمزور بھائی بند پیچھے رہتے رہتے آخر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر نہیں اٹھتے۔

یہ مسئلہ ارتقا کا ایک رکن رکین ہے۔ اسی کا نام قدرتی انتخاب یا بقائے بہترین ہے۔ ڈارون کہتا ہے "یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جانداروں کے ایک دوسرے سے اور قدرتی کیفیات حیات سے باہمی تعلقات نہایت ہی پیچیدہ اور وابستہ ہیں۔ لہذا ذرا سا اختلاف جسمانی بھی ان پر نہایت موثر ہو سکتا ہے۔ جب خود انسان کے لئے ذرا ذرا سے فرق مفید یا مضر ثابت ہو چکے ہیں۔ تو اس میں کیا تعجب ہے کہ اسی طرح کے تھوڑے تھوڑے سے فرق ہر قسم کے جانوروں میں بھی واقع ہو کر کشاکش ہستی کا فیصلہ ادھر یا اُدھر کر دیتے ہوں۔ کیونکہ جب فرق کو مان لیا تو پھر جو جانور ذرا سی بھی فضیلت رکھتا ہوگا۔ قیاس غالب ہے۔ کہ اتقائے نسل میں بڑا حصہ وہی لیگا۔ اور جس میں ذرا سا بھی نقص ہوگا۔ اس کی نسل منقطع اور ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائیگی۔ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس قدر افراد پیدا ہوتے ہیں کہ ان سب کا رہنا امکان سے باہر ہے۔ اسی

محاسن کے ابقا اور قبائح کے ازالہ کا نام میں نے "قدرتی انتخاب" یا "ابقائے بہترین" رکھا ہے"۔

اس مسئلے کے ضمن میں قانون اختلاف خود بخود آجاتا ہے۔ کیونکہ جب تک اختلاف نہ ہو تب تک انتخاب ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ قدرتی نہ مصنوعی۔ مگر اختلاف تو عام اور قدرتی بات ہے۔ اور اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جانوروں میں مشابہت کی بجائے مغائرت ہے۔ یکسانی کی بجائے گوناگونی ہے۔ مگر یہ یاد رہے اور یہ فرق گوناگونی اصلی ساخت میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف بیرونی اعضا اور خط و خال میں ہے۔ ہر ایک قسم کے مختلف افراد ظاہری فرق کی وجہ سے باہم ممیز و ممتاز ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں مشابہت تام صرف نام ہی نام ہے۔ ایسے دو توام بھائیوں کا وجود بھی محال ہے۔ جن کی ساخت۔ سیرت اور صورت میں مطلق کچھ فرق نہ ملے۔ والدین کی یگانگت یا قدرتی حالات پیدائش کی موافقت کیسی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ پوری مماثلت پیدا نہیں کر سکتی۔ قدرت اپنی لامحدود پیدا کردہ چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی پورا اعادہ کرنا نہیں چاہتی۔ یعنی اس عظیم الشان کارخانے میں دو ریت کے ذرے بھی بعینہٖ یکساں نہیں ہیں جس احتیاط سے وحدت کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی توجہ سے کثرت کو پیش نظر کیا ہے۔ اس واسطے جب ذی حیات اشیا پردۂ عدم سے میدان وجود میں آتی ہیں تو الگ الگ طاقتیں اور جدا جدا کیفیتیں لاتی ہیں۔ بظاہر یہ فرق خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ لیکن معیار اتنا لطیف ہے۔ کہ ایک ایک کو پرکھ لیتا ہے۔ اور ذرّے ذرّے کو دیکھ لیتا ہے۔

ارتقا کے مسئلے میں یہ باتیں بنیادی پتھر ہیں۔ خلقی طاقتوں کی نابرابری سے آئندہ کے نمایاں اختلافوں کا پتہ چلتا ہے۔ ہر قسم کے افراد سلسلہ حیات بہم پہنچا کر اپنے آپ کو اس سخت امتحان کے لائق بنانا شروع کرتے ہیں۔ مگر زیادہ طاقتور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور ان کی کامیابی ہی ان قوے کو جن سے کامیابی حاصل ہؤا کرتی ہے۔ ان کی نسل میں دائمی اور روز افزوں بنا دیتی ہے۔ کیونکہ طاقت اور کامیابی کی وجہ سے وہ توالد و تناسل میں زیادہ

حصہ لیکر اپنی ازدیاد نسل کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ان کی اولاد میں وہی طاقتیں موروثی ہو کر دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہیں۔ یوں قوانین فطرت کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ اور جانوروں کو تکمیل کی خاص خاص صورتوں کی طرف لئے جاتا ہے۔ مگر وہ جو کمزور تھے ان کا کیا حشر ہوا؟ ظاہر ہے کہ یا تو وہ بالکل مٹ گئے۔ یا ان کے کامیاب بھائی بندوں کی اولاد نے ان کو اس موروثی رہائش گاہ سے نکال دیا۔ اور ان کو نقل مکان کرکے اور جگہ جانا پڑا۔ جہاں ممکن ہے کہ کیفیات زندگی ان کے وطن سے بہت کچھ مختلف ہوں۔

اس مسئلے کی توضیح کے لئے شاید چند واقعی مثالیں بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو۔ مثلاً پھولدار درختوں کے اس وسیع حصے کو لیجئے جن کی نسل افزائی زر گل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس لئے جو چیز زر گل کو زیادہ پراگندہ کرتی ہے وہ اس خاص قسم کے پودوں کی بہبودی اور ترقی میں ساعی ہے۔ یہ کام اکثر چھوٹی چھوٹی تیتریاں اور بھونرے کرتے ہیں۔ جو پھول پھول پر اڑتے پھرتے ہیں اور نادانستہ تخم ریزی بھی کرتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس بات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا وہ خود اپنی دھن میں لگے ہوتے ہیں۔ یعنی تلاش معاش اور گرد آوری خوراک۔ پھولوں میں شہد ہوتا ہے جس کی لالچ ان ننھے ننھے پرندوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اور قدرت حقیقی ان کو شہد دے کر ان سے تخم ریزی کا کام لیتی ہے (سبحان اللہ کیا شان ایزدی ہے خواہ کوئی شخص کتنا ہی کور باطن اور کوڑھ مغز کیوں نہ ہو۔ ممکن نہیں کہ اس نہایت ہی عجیب و غریب اور بے مثل انتظام اور کاریگری کو دیکھ کر عش عش نہ کرے اور شان الٰہی پر قربان نہ ہو) یہ بات صاف ہے کہ جس قسم کے پھولوں میں یہ شیریں مادہ زیادہ ہوگا اسی پر زیادہ بھونرے آئینگے۔ اسی کا زر گل زیادہ پھیلیگا۔ اور وہی زیادہ پھولے پھلے گا۔ اور جس قسم کے پھولوں میں یہ دل کش شہد کسی وجہ سے کم ہوگا۔ اسی کی طرف تیتریوں کی توجہ کم ہوگی۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری نسل میں وہ دل کش قسم تمام میں پھیل جائیگی۔ اب اس عمل کا تسلسل یقینی بات ہے۔ اور اس قسم کا روز بروز زیادہ پھیلنا ظاہر

Marfat.com

ہے۔ ممکن ہے کہ ترقی کی رفتار دھیمی ہو۔ مگر رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اس کا پھیلنا۔ اچھی جگہیں گھیر لینا۔ حریفوں سے بڑھ جانا اور آخر ان کو بالکل نکال کر ابقائے بہترین کی مثال بن جانا ضروری اور قطعی ہے۔

عالم حیوانات میں اس کا اثر اور بھی زیادہ ہے۔ اور کشاکش ہستی کے گھمسان کا میدان یہی ہے۔ کیونکہ اگر قدرت کثرت حیوانات کو اس کے ذریعے سے کم نہ کرے تو سطح زمین پر نباتات وغیرہ کا ٹھکانا نہ رہے۔ اور اس کے ساتھ پھر جانوروں کا کھانا نہ رہے۔ اس لئے حیوانات میں یہ کشاکش ہستی ہمیشہ چلی جاتی ہے۔ اور اس کی تین صورتیں ہیں:۔

(۱) ایک ہی قسم کے افراد کی باہمی لڑائی بھڑائی۔

(۲) ایک قسم کے افراد کا دوسری قسم کے افراد سے مقابلہ۔

(۳) افراد یا انواع کی آس پاس کی کیفیات جسمانی سے کشمکش۔

سب جانتے ہیں کہ قدرت ہر قسم کے جانداروں کے اجرام اور توالد و تناسل کے اسباب مہیا کرنے میں نہایت فیاضی اور فضول خرچی سے کام لیتی ہے۔ جانور اتنے پیدا ہوتے ہیں کہ سب کا رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض قسم کے درختوں کے بیج اتنے بے حد زیادہ ہوتے ہیں۔ کہ اگر نہایت کثرت سے ضائع نہ ہو جایا کریں۔ تو چند دن ہی میں دنیا کے پردے پر ان درختوں کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہ دے۔ اس طرح گویا کشاکش ہستی اجرام ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ اور مرکر ہی ختم ہوتی ہے۔ یہی حال بری اور بحری جانوروں کا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ایک کوڈ (Cod) مچھلی ہر موسم میں تیس تیس لاکھ انڈے دیتی ہے۔ اگر نہایت زود اثر اور کارگر طریقوں سے ان کی بہتات کو نہ روکا جاتا تو چند دنوں میں بحر ظلمات ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پٹ کر امریکہ و یورپ میں ان مچھلیوں کا زندہ پل بن جاتا۔ خرگوشوں اور بٹیروں وغیرہ کا بھی بعض ملکوں میں یہی حال ہے۔ اب قدرتی انتخاب کے ان طریقوں کو دیکھنا چاہئے۔ جن سے یہ کثرت حیوانات روکی جاتی ہے۔ کشاکش ہستی جانوروں کی ہستی کے ساتھ شروع ہوتی

Marfat.com

ہے۔ اکثر انڈے برباد ہو جاتے ہیں۔ اول تو ادر بہت سے جانور ہی ان کی جان کے دشمن ہیں۔ ان سے بچے تو آندھی اور طوفان سے پالا پڑا۔ موسموں کی سختی اجرام سے لیکر مکمل اجسام تک کو نہیں چھوڑتی۔ ۱۹۰۵ء کی سی ایک ہی سردی دور دور کے درختوں اور قسم قسم کے جانوروں کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ایسے کڑے امتحانوں سے وہی بچتے ہیں جو سب سے اچھے اور طاقتور ہوں۔ اور یہی آیندہ نسلوں کے ابوالآباء ہوتے ہیں۔ مگر ابھی ہم کو پہلے ہم جنس افراد کی خانہ جنگی کو دیکھنا ہے۔ سچ یہ ہے کہ قدرت کا مطالعہ کرنے والے کو اس سے زیادہ بے رحمی اور بے دردی کی مثال اور کوئی نہیں ملتی۔ اس پر غور کرنا بہت ہی جانکاہ اور دل شکن ہے۔ یہ ظالم اور مظلوم کی لڑائی کی داستان ہے۔ جس میں ظالم ہمیشہ ور رہتا ہے طاقتور کمزور کے منہ کا لقمہ چھین لیتا ہے۔ اور وہ غریب منہ دیکھتا اور ترستا کا ترستا رہ جاتا ہے۔ اس میں نہ رحم ہے نہ ہمدردی اور آخر میں پشیمانی اور ندامت بھی نہیں۔ ماں باپ کچھ دن تک اپنے بچوں کو پالتے ہیں۔ مگر یہ تعلق چند روزہ ہے۔ بڑے ہوئے تیسچھے ہمدردی اور غمخواری کیسی شناسائی تک نہیں۔ ہماری اپنی نوع میں ہی کشاکش ہستی کے ظلم وستم۔ بے رحمی اور سنگدلی کی مثالیں تاریخ کے ہر صفحے پر ملتی ہیں۔ گویا کوئی شخص بآواز بلند تمام عالم حیوانات میں اس حاوی قانون کا اعلان کر رہا ہے کہ طاقتور آباد اور کمزور خانہ برباد ہے۔ مختلف الجنس افراد کی لڑائی کی مثالوں سے عالم پُر ہے۔ عالم نباتات میں مثال کے طور پر ہم دیکھ ہی چکے کہ کیونکر ایک قسم دوسری قسم کو مٹائے دیتی ہے۔ یہی حال سب کہیں ہے۔ کائی سے لیکر پیپل اور برگد تک ہر ایک قسم باقی قسموں کو نکال کر ساری جگہ خود ہی گھیرنے کے درپے ہو رہی ہے اور دنیا کی نباتات کی تاریخ میں جنگلوں کے جنگل یوں ہی ادل بدل ہو جاتے ہیں۔ عالم حیوانات میں ایک نوع دوسری نوع کو کھائے جاتی ہے۔ چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک اور مچھر سے لے کر آدمی تک سب ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

درندے چرندوں کو شکار کرتے ہیں۔ پرندے پرندوں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ مچھلیاں آپس میں ایک دوسرے کو کھا کر گزارا کرتی ہیں۔ اور حشرات الارض بڑے بڑے جانوروں کو ہڈیوں کی مالا اور محض ڈھانچہ ہی ڈھانچہ بنا دیتے ہیں۔ غرض جہاں جائیں وہی نفسی نفسی کی دھوم مچ رہی ہے۔ انقلاب اور ارتعاش کی لہریں تمام عالم ہستی میں پھیل رہی ہیں۔ جانوروں پر ہی نہیں بلکہ نباتات پر بھی ان کا اثر یکساں ہے۔ اور ان کی وجہ سے تمام جاندار چیزیں باہم وابستہ اور پیوستہ ہو رہی ہیں۔ آدمی سیر دیکھنا چاہے تو دنیا کا میدان کارزار سامنے ہے۔ جہاں جائیگا یہی تماشا پائیگا۔ اور یہی کشاکش کا نظارہ نظر آئیگا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ ان سب پر طرہ یہ ہے کہ قدرتی اسباب بھی ان کی بہتری اور بہبودی میں سدّ باب ہیں ؂

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز — شکستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

دنیا کے بعض حصّوں میں اور بالخصوص شمال کی طرف شدت سرما نباتات کو بڑھنے ہی نہیں دیتی۔ اس لئے جانور بھی کمیاب ہیں۔ بعض حصوں میں قدرتی اسباب سے آثار حیات پہلے کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اور ہوتے ہوتے آخر بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اور ان اسباب کی مخالفت تو ہر جگہ ظاہر ہے۔ قدرت آثار حیات کو پیدا تو کرتی ہے مگر ان کے قیام اور بقا کو روکتی اور دشوار کرتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو بالکل جلاّدہی بن جاتی ہے۔ اور سب جاندار ہر دم جان جوکھوں میں رہتے ہیں۔ ؂

برو از خانۂ گردوں بدر و ناں مطلب — کیں سیہ کاسہ در آخر بکشد مہماں را

انقلابات زمینی میں افراد نہیں بلکہ نسلیں کی نسلیں نابود ہو جاتی ہیں۔ طرح طرح کی بیماریاں۔ وضع و صنع کی دبائیں خاندان کے خاندان ویران اور شہر کے شہر سنسان کر دیتی ہیں۔ اور یہ کچھ نوع انسان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ذی حیات کے حق میں یکساں مضر ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ادنےٰ درجے کے جانور یا کسی قسم کے درخت ان کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ تمام نباتات اور حیوانات سب کی جان پر یہی آفت ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ بلائیں

قدرت کی تلوار ہیں۔ جس کے وار سے بچنا دشوار ہے۔ سہ

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ چیست + شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

موسموں کا انقلاب ایک اور عذاب ہے۔ تمام جاندار اشیا فطرتاً اپنے وطن کی آب وہوا برداشت کرنے کے قابل بنائی گئی ہیں۔ اگر اس میں اوسط سے زیادہ کمی بیشی ہو تو ان کی خیر نہیں۔ یہ طبعاً ذکی الحس ہوتی ہیں۔ اور بعض قسم کے پودے اور جانور تو نہایت ہی نازک ہوتے ہیں۔ جب کبھی گردش روزگار اور انقلاب لیل ونہار سے موسموں کی سختی معمول سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ تو ان پر گویا آسمان پھٹ پڑتا ہے۔ بیسیوں قسم کے جانور اور درخت ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں قسمیں کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہیں۔ بعض سنبھل بھی جاتی ہیں۔ ان کے لئے یہ مرگ انبوہ جشن ہو جاتا ہے (اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْد) آثار حیات کی وہ داستان جو قدرت کے زبردست قلم نے طبقات الارض کے سنگین ورقوں پر لکھ کر کالنقش فی الحجر کر دی ہے۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ایسے انقلاب زمینی کے بعد جانوروں کی صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ گویا قدرتی کیفیات میں خلل پڑ جانے سے جانور از سر نو زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں اور ان کی صورت وسیرت میں فرق آنے لگتا ہے +

یہ انقلابات زمینی کچھ نادر نہیں ہیں۔ بر وبحر ہمیشہ باہم برسر پرخاش ہیں۔ پانی کا زور چلتا ہے تو ملکوں کو چھپا لیتا ہے۔ زمین کو جوش آتا ہے۔ تو سمندروں کو سکھا دیتی ہے۔ اگرچہ عموماً یہ انقلاب ناگہانی نہیں ہوتے۔ رفتہ رفتہ ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ضرور ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہی مختلف اقسام کے حیوانات میں بھی تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک حد تک قدرتی انتخاب کا مدار اس پر بھی ہے +

ان سب کو چھوڑ کر اس کشاکش ہستی میں ایک اور طاقت بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کو **انتخاب ازواج** کہتے ہیں۔ اختلاف اقسام میں یہ طاقت بھی بہت موثر اور کارگر ہے۔ اور پالتو جانوروں کی مختلف قسمیں اور خاص خاص خوبیاں

Marfat.com

محض انتخاب ازدواج کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہیں۔ جانوروں کے پالنے والے اور رکھوالے خاص طرح کے پسندیدہ بچے حاصل کرنے کے لئے نسلاً بعد نسلٍ صرف ایسے نر و مادہ کا جوڑا ملاتے رہے۔ جن میں وہ مجوبہ باتیں زیادہ نمایاں تھیں۔ اور آج پالتو جانوروں کی بیشمار قسموں میں اس طاقت کی تاثیر اور ان لوگوں کے نتائج کی تکمیل دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ عجیب عجیب قسموں میں سے ایک قسم کے مویشی ہیں جن کے اب مطلق سینگ نہیں ہوتے اور سر کا وہ حصہ بالکل گول اور صاف ہوتا ہے۔

اسی طرح خوبصورت اور پست قد پشتے کُتّے سے لیکر ہیبتناک بلند قامت بلڈاگ اور سینٹ برنارڈ کے تمیزدار ماسٹف تک کتوں کی الگ الگ بیشمار قسمیں ہیں۔ گھریلو مرغیوں اور کبوتروں وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور یہ سب محض اس بات کا کرشمہ ہے کہ پالنے والے نے چند سب سے زیادہ پسندیدہ جانوروں کو چھانٹ کر ان سے بچّے لئے جن کو وہ خوبیاں اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھیں۔ پھر ان بچوں میں اسی قسم کا انتخاب ازدواج استعمال کیا۔ اور اسی طرح کے تسلسل سے ایسے حیرت انگیز اور تسلی بخش نتیجے پیدا ہو گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی اصول کو مخالف صورت میں استعمال کرنے سے چند نسلوں میں بالکل برعکس نتیجے پیدا ہوں۔ اور صدیوں کے تفرقے مٹ کر از سرِ نو یکسانیت اور مشابہت پیدا ہو جائے۔ یہ مشہور بات ہے کہ دوغلہ جانور قد و قامت۔ صورت و سیرت۔ رنگ ڈھنگ اور عقل و تمیز میں اپنے اصل ماں باپ کے بین بین ہوتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ قدما نے اتنے حاوی اور زبردست اصول کو کیونکر نظر انداز کر دیا جس کے نتائج ایسے نمایاں اور جس کا استعمال اتنا وسیع اور عام ہے۔ یہ بھی حیرت ہے کہ متاخرین نے بھی اس قانون کو صرف پالتو جانوروں ہی تک محدود سمجھا اور قدرتی دنیا پر اس کو حاوی کرنیکا خیال تک نہ کیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک فلاسفہ تک کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ جو کام پالتو جانوروں میں انسانی عقل کرتی ہے قدرت اپنے کارخانے میں وہی کام حیوانی عقل سے لیتی ہے۔ اور اگرچہ

Marfat.com

اس کا فرق اتنی جلدی نظر نہیں آتا مگر اس کا ہونا دونوں جگہ یکساں یقینی اور لازمی ہے۔ مشاہدے اور تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انتخاب ازواج قدرتی طور پر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اور اپنے اپنے کام میں حیوان بھی انسان سے کچھ کم سمجھدار اور عقلمند نہیں ہیں۔ وحشی جانوروں کی چال ڈھال کا مطالعہ اتنی غائر اور محتاط نظر سے کیا گیا ہے۔ اور ان کے نتائج اتنے غور و خوض سے جانچے گئے ہیں۔ کہ اب اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہا۔ کہ جانوروں کی اکثر قسموں کا فرق صرف انتخاب ازواج کا نتیجہ ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے مثال لیجئے تقریباً تمام قسم کے جانوروں میں طاقتور نر کمزوروں کو مار کر بھگا دیتے ہیں۔ اور آپ ہی آیندہ نسل کے بانی بن جاتے ہیں (مرغوں کی لڑائی اسی پر ہوتی ہے) گویا یہاں کشاکش ہستی میں سب سے اچھا حربہ جسمانی قوت ہے۔ اس میں قدرت بھی اس کی صاف مدد کرتی نظر آتی ہے۔ جن جانوروں کے سینگ ہر سال جھڑ کر نئے آتے ہیں۔ وہ گویا ہنگام نرباد گی کے لئے مسلح ہوتے ہیں۔ کیونکہ سینگ لڑنے کے لئے ہیں۔ اور لڑنا ماداؤں کے لئے جب لڑائی بھڑائی اور توالد و تناسل کے دن گزر گئے تو سینگ بھی اتر گئے۔ اور نر گویا نہتے رہ گئے مگر دوسرا موسم آیا۔ اور انہوں نے بھی اپنے سینگوں کے بھالے سنبھالے۔ اس کے علاوہ مادائیں خود بھی انتخاب کرتی ہیں۔ اور کبھی کبھی متواتر ایک ہی قسم کے نروں کو پسند کرتی ہیں۔ وجہ انتخاب کہیں قد و قامت۔ زور و طاقت اور سبکروی اور تیز دوی ہوتی ہے کہیں رنگ و روپ یا چہرہ مہرہ ہوتا ہے۔ اور کہیں بظاہر نامعلوم ہوتی ہے۔ پرندوں کے پروں کی چمک دمک نے اس کام میں بڑا حصہ لیا ہے۔ عموماً نر ہی زیادہ خوش لباس اور شوخ رنگ ہوتا ہے۔ کبھی مادہ بھی ہوتی ہے۔ مگر اکثر نر ہی ہوتا ہے۔ لیکن اب تک ہم کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ دلکش رنگ اور یہ رعنائی و زیبائی خود ان کی ماداؤں کی ہی حسن پرستی سے پیدا ہوئی ہے۔ اگرچہ شاید سینکڑوں ہزاروں نسلوں کے بعد۔ غرض دنیا کے بڑے سے بڑے جانور سے لیکر کرمک شب تاب تک پر بھی انتخاب ازواج کا اصول آہستہ

آہستہ مگر برابر اپنا اثر دکھاے جاتا ہے۔ اختلاف اقسام میں ایک اور بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ کبھی اولاد یکایک یا کم از کم جلدی جلدی اپنی آبائی صورت سے بدل جاتی ہے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے (ہوتا ہے سے ہماری یہ مراد نہیں کہ بلا وجہ محض اتفاق سے ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہ ابھی تک اس کی صحیح وجہ اور ٹھیک سبب معلوم نہیں ہوا) کہ کوئی نو پیدا شدہ جانور صورت سیرت اور چال چلن میں اپنے ماں باپ۔ بلکہ اپنی تمام معلومہ نسل سے جدا ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا یکایک ایک نئی قسم پیدا ہو گئی۔ یہ ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ حیات حیوانی میں ان ناگہانی اختلافوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے۔ بعض مشاہدین کا خیال ہے کہ یہ محض ایک استثنا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ چند نسلوں کے بعد وہ خاص فرق مٹ جاتا ہے۔ بعض محققین کی راے ہے کہ کم از کم کبھی کبھی یہ فرق قائم رہ کر ایک نئی قسم کا آغاز ہو جاتا ہے +

کشاکش ہستی میں مذکورۂ بالا مقابلے اور مقاتلے کے علاوہ بعض اور بھی باتیں ہیں جو بقاے بہترین کے اصول پر اثر ڈالتی ہیں۔ یہ اصول مسئلہ ارتقا کا اصل اصول ہے۔ اب ہم اس پر اتنی گفتگو کر چکے ہیں کہ اب اس کا استعمال اور اس کی خوبی دکھائی جانی ممکن ہے +

پہلے تو اس علم کی چند ضروری اصطلاحیں دیکھ لینی چاہئیں تاکہ اس کی بحث میں سہولت ہو جاے۔ اشیاے کائنات میں تین حصے پاے جاتے ہیں۔ جن کو موالید ثلاثہ کہتے ہیں۔ یعنی عالم جمادات۔ عالم نباتات اور عالم حیوانات یہ عالم طبقوں[۱] میں منقسم ہیں اور طبقے درجوں[۲] میں۔ درجے جنسوں[۳] میں۔ جنسیں نوعوں[۴] میں نوعیں قسموں[۵] میں اور قسمیں فردوں[۶] میں تقسیم کر رکھے ہیں۔

(Kingdom, Order, Suborder, Genera, Species, Varieties, and Individuals)

اس باقاعدہ اور مرتب تقسیم کے علاوہ کہیں کہیں جماعت اور خاندان کے لفظ بھی آجاتے ہیں۔ مگر اصل تقسیم وہی ہے جو ہم نے بیان کی +

گزشتہ صفحوں میں ہم نے دیکھ لیا - کہ ارتقا کیونکر افراد کو ظہور میں لاتی ہے- طرز عمل کا یہ حصہ اتنے بے انتہا عام تجربوں اور معمولی مشاہدوں سے ثابت ہو چکا ہے- کہ اس میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی - تمام جانوروں میں یہ کیفیت مشترک ہے- جرم سے جنین بننے تک جنین سے جاندار بچہ بن کر نکلنے تک - بچپن سے جوان ہونے تک - جوانی سے مرنے تک تمام جانوروں کی وہی ایک داستان ہے- اب سوال یہ ہے کہ یہ اصول جو افراد زندگی میں دیکھے گئے ہیں- ان کا اثر قسموں - نوعوں - جنسوں - درجوں طبقوں اور آخر میں عالموں پر کہاں تک پڑتا ہے- یعنی یہ بات کہاں تک صحیح ہے- کہ جس طرح تمام وضع وضع کے جانور یکساں اجرام سے بنے ہیں - اسی طرح یہ مختلف قسمیں اور نوعیں اور آخر کار جنسیں اور درجے بھی ایک طرح ہم صورت جانوروں کے آہستہ آہستہ بڑھنے والے فرق سے پیدا ہوئے ہیں *

ہماری مذکورۂ بالا بحث سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون افراد سے اقسام کی طرف پھیلتا ہے- کیونکہ ہم پالتو اور وحشی جانوروں کی گونا گونی میں براۓ العین دیکھتے ہیں کہ انتخاب ازواج اور قدرتی انتخاب کیونکر افراد میں انقلاب پیدا کرکے اختلاف اقسام کا باعث ہوتے ہیں- اور مشاہدے اور تحقیق نے اس قانون کی صدہا مثالیں معلوم کی ہیں- جن سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ جانوروں کی مختلف قسمیں کشاکش ہستی کے جدا جدا سامانوں سے پیدا ہو جاتی ہیں- اب یہ بات قابل غور ہے کہ آیا اختلاف انواع و اختلاف اجناس میں بھی اس کا کچھ اثر ہے یا نہیں *

گزشتہ صدی میں اس سوال پر بہت کچھ غور کیا گیا - سب سے پہلے یہ بات مشاہدہ کی گئی کہ حیوانات و نباتات کی بعض انواع دیگر انواع کی نسبت باہم زیادہ مشابہ ہیں - زیادہ غور سے ان کی مشابہت اتنی بڑھی ہوئی نظر آئی کہ ان کی نوعیت میں شک ہونے لگا - اور خیال ہوا کہ شاید یہ خود الگ نوع نہیں ہیں- بلکہ کسی ایک ہی نوع کی چند قسمیں ہیں - اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض قسمیں باہم اتنی مختلف ہو گئی تھیں کہ ان کا فرق نوعوں کے باہمی فرق کے

Marfat.com

برابر ہو گیا تھا۔ ان باتوں کی برابر تحقیق و تفتیش ہوتی رہی یہاں تک کہ آخر تمام عالم حیوانات کا ایک ہی قسم کے افراد کی مختلف اقسام ہونا ممکن معلوم ہونے لگا۔ عقل کے آفتاب کی اس ایک جھلک سے تمام عالم دماغ جگمگا اٹھا۔ اس کی چمک میں نوعیں معدوم ہو گئیں۔ جنسیں مٹ گئیں۔ درجے ٹوٹ گئے۔ طبقے اُلٹ گئے۔ اور تمام عالم کائنات ایک عظیم الشان و یکساں وحدت کا سماں دکھانے لگا صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چند جرموں سے یہ ساری عجیب و غریب گوناگونی اور رنگا رنگی نظر آنے لگی جیسے ایک چھوٹا سا بیج بڑھ کر سر بفلک درخت کے ڈال ڈال۔ شاخ شاخ۔ ٹہنی ٹہنی اور پتی پتی میں پھیل جاتا ہے ❖

اسی طرح مسئلہ ارتقا کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی کے انقلاب اس کی قسم کی عمر کے انقلابوں کا چھوٹا نمونہ ہیں۔ یعنی جرم بڑھتے بڑھتے جس طرح نیا جسم بن جاتا ہے۔ اسی طرح جسم بدلتے بدلتے نئی قسم ہو جاتا ہے۔ یہاں ضمناً یہ بات آجاتی ہے کہ ایک نوع کی مختلف اقسام ایک ہی جرم سے بنتی ہیں۔ اس کے آگے یہ بات ابھی محقق نہیں ہوئی کہ آیا مختلف نوعیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یا خود بھی کسی ایک ہی اصل کی جدا جدا قسمیں ہوتی ہیں۔ اس کا جواب دینا موجودہ معلومات میں دشوار ہے مگر ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آثار حیات کے خطوط متوازی نہیں ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک ہی نقطۂ ماسک کی طرف سے پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا تغیر و تبدل محض اختلاف حالات اور انقلاب کیفیات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ❖

عالم حیوانات کے ان قانونوں سے انسان مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور ہم کو اپنا اصلی سوال چھوڑ کر اس مسئلہ کی تشریح کے لئے اتنی دور محض اس لئے جانا پڑا۔ کیونکہ یہ ہماری نوع کی ابتدائی کیفیت کی ایک حد تک توضیح کرتا ہے۔ اور اب ہم کو یہی دیکھنا ہے کہ وہ توضیح کیا ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ حیات انسانی اور حیات حیوانی میں نہایت گہرا لگاؤ ہے۔ اشرف المخلوقات بھی اسی عظیم الشان درخت کا ایک پھول ہے۔ جس میں ارذل الحیوانات کے کانٹے

Marfat.com

ہیں۔ اس وسیع خاندان کے باہمی تعلقات اور رشتوں پر غور کرنا بڑا دلچسپ اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مسئلہ ارتقا کے نزدیک انسان اپنے سے کم درجے اور سادہ ساخت کے جانداروں کا خلف الرشید ہے۔ مگر وہ جاندار بھی نتھے انسان ہی۔ بندر یا لنگور نہ تھے۔ البتہ ان کی طرز زندگی اور قوائے جسمانی و دماغی اتنے مکمل اور قوی نہ تھے۔ اس زمانے کے بندر اور لنگور بھی آج کل کے سے نہ تھے۔ بلکہ ان سے کم درجے کے تھے۔ گویا جو فاصلہ ان جانوروں اور انسانوں میں اب ہے۔ اس سے کچھ ہی کم تب بھی موجود تھا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی وضع میں ترقی کی ہے۔ ہاں اگر پیچھے ہٹتے چلے جائیں تو ایک وقت اور ایک جگہ ایسی آجاتی ہے جہاں تمام قسم کے بندر اور آدمی ایک ماں باپ کے گرد چھوٹے بڑے بھائی بہنوں کی طرح حلقہ باندھے اپنی اپنی سمتوں میں بڑھ کر ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے کو ہاتھ ملائے جدا جدا ہونے کو تیار کھڑے ہیں۔ کیونکہ اس دار الفراق دنیا میں ایک دفعہ اس طرح جدا ہو کر پھر ملنا کیسا پاس آنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر نظر کو زیادہ وسیع کریں اور تھوڑی دور اور بڑھیں تو ایک طرف سے درندے اور دوسری طرف سے چرندے بھی قطار در قطار چلے آتے ہیں۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دادا کی اولاد ہیں جن کو زوجی انتخاب اور قدرتی انقلاب نے قسموں اور نوعوں میں تقسیم کر کے آخر مختلف الاجناس بنا دیا۔ ان قیاسات کا میدان وسیع ہے۔ اور ان کو جہاں تک پھیلانا چاہیں۔ پھیلتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ محض قیاس ہی قیاس نہیں ہیں۔ بلکہ علوم طبعیات کی تحقیقات ان کی تاکید اور تائید کرتی ہے۔ اور صاف بتلاتی ہے کہ تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ یعنی ایک زمانے میں اس قسم کے جانور موجود تھے۔ جن میں اس طرح کے موجودہ تمام برّی اور بحری جانوروں کی طاقتیں اور قوتیں مضمر تھیں آخر ہزارہا نسلوں کے بعد ان کی عادتیں بدل بدلا کر مذکورۂ بالا قانونوں نے اپنا اثر نمایاں کر دیا۔ اور ان جانوروں کی مختلف قسمیں ہو گئیں۔ صدہا دیگر نسلوں میں ان قسموں میں بھی اختلاف اتنا نمایاں ہو گیا کہ ان کی مختلف نوعیں

بن گئیں۔ یہی عمل برابر جاری رہا یہانتک کہ آج ان کی کثرت سے زمین بھری ہوئی ہے اور سمندر پٹا پڑا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ریڑھ کی ہڈی والے اور دوسرے جانوروں کا ڈھانچہ بھی بہت ملتا جلتا ہے اور آگے چل کر گھونگے کی قسم کے جانور بھی انہی میں آ ملتے ہیں۔ مگر یہ اتفاق اجناس اور اس سے بھی زیادہ وسیع بحث یعنی اتحاد درجات وطبقات کا مسئلہ ابھی تک قیاسی ہی ہے عملی واقعات اس کے ثبوت کے لئے پیش نہیں کئے جا سکتے۔ اور اس بات کا دعوے نہیں ہو سکتا کہ اصل میں تمام حیوانات متحد الاصل اور ایک ہی ابوالاباء کے اولاد واحفاد ہیں۔ یہی حال اس سے بھی زیادہ وسیع بحث یعنی اتحاد عالم حیوانات ونباتات کا ہے۔ ممکن ہے کہ مختلف جنسیں الگ الگ ماخذوں سے پھیلی پھلی ہوں۔ یا سب کی سب ایک ہی ماخذ سے نکلی ہوں۔ قیاس تو ان کا بھی اتحاد ہی چاہتا ہے۔ لیکن اس بحث کا عملی فیصلہ دنیا آیندہ نسلوں کی فہانت و ذکاوت پر موقوف ہے۔ اس کی بابت یہ مسئلہ بالکل علم الالسنہ کی مانند ہے۔ وہاں بھی ہم جانتے ہیں کہ یورپ کی مروجہ زبانیں فارسی اور سنسکرت ایک ہی زبان سے نکلی ہیں۔ اسی طرح عربی۔ عبرانی۔ سریانی اور کلدانی ایک ہی کان سے نکلی ہیں۔ مگر ان دونوں خاندانوں کا باہمی رشتہ ابھی تک صرف قیاسی ہی ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ حبشیوں کی بولیاں اور مغلوں کی زبانیں بھی ملا لیں۔ تو مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ایک جنس کی انواع واقسام کے یگانگی تو یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ طبقات الارض کے آثار محفورہ متحجرہ میں ان کے ابتدائی بزرگوں کے نمونے ہاتھ آ گئے ہیں۔ لیکن اس سے آگے صرف قیاس ہی ہے۔ عملی ثبوت اور قطعی دلیل نہیں ملی۔ گو ممکن ہے کہ آیندہ کبھی مل جائے۔

غرض اس طرح اس مسئلے کے مطابق اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ ادنے درجے کے ہونگے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ ہونگے کیسے۔ ہمارے علم کی موجودہ حالت میں ان کا صحیح تصور کرنا ذرا مشکل ہے۔ عملی تحقیقات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نوع کے ابتدائی نمونوں (جو غالباً اپنے بزرگوں سے کچھ ہی

Marfat.com

مختلف ہونگے) اور بن مانسوں میں اگر کچھ فرق تھا۔ تو صرف یہ تھا کہ ہم آگ جلا سکتے اور کچھ اوزار بنا سکتے تھے۔ بہرحال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہ تحقیقات ہمارے مسئلہ ارتقا کے مطابق اور اس کی مصدّق ہے +

ہم نے موجودہ مسئلے پر خالی الذہن ہو کر ہر قسم کے تعصّب اور سخن پروری کو چھوڑ کر بحث کی ہے۔ اور آفرینش عالم کی بابت دونوں مختلف اور مخالف خیالوں کو پوری وضاحت سے پیش کر دیا ہے۔ ان دونوں عقیدوں میں فرق صرف طرز عمل کی بابت ہے۔ اصل مسئلے کے متعلق کسی کو کلام نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے کرۂ زمین پر کوئی جاندار شئے نہ تھی۔ اب ہے۔ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس شئے کا وجود ہؤا ہو۔ بحث یہ ہے کہ یہ وجود کب ہؤا۔ اور کیونکر ہؤا یہ نہیں ہے کہ ہؤا یا نہیں ہؤا۔ اس لئے جو کچھ بیان کیا گیا اس کو کسی قسم کے عقائد مذہبی سے علاقہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس کو ملحوظ خاطر رکھینگے اور ہماری اس رام کہانی پر انصاف سے غور کرینگے +

باب سیزدہم

مسئلۂ ارتقا کی چند مثالیں

مسئلۂ ارتقا کے ضمن میں زمین کی پیدائش کا بھی مختصر حال لکھ دینا چاہئے۔ زمین انسان کا مسکن ہے۔ اور کون ایسا مردہ دل اور افسردہ طبع شخص ہوگا۔ جو اس خاکی کرے کی ابتدائی کہانی دلچسپی سے نہ سنیگا۔ جس کے دامن شفقت میں وہ بڑا ہو کر پھلا پھولا ہے۔ جس کی گود میں اس کے باپ دادا اور بہن بھائی موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ اور جس کی آغوش محبت میں اسے خود بھی ایک نہ ایک دن ضرور آرام کرنا ہے +

زمین بھی بڑھتی ہے۔ یہ بھی اچانک پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ صدہا مدارج ترقی

Marfat.com

اور ہزار ہا معارج کمال طے کر کے اس موجودہ حالت پر پہنچی ہے۔ ایک وقت تھا
جب ہمارے اس نظام شمسی کی جگہ سورج کے چاروں طرف مختلف گیسیں پھیلی
ہوئی تھیں۔ شدت حرارت سے ان عظیم الشان سیّاروں کا مادّہ رقیق ہو رہا تھا۔
آخر رفتہ رفتہ برودت اور انجماد کا عمل شروع ہؤا۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ مرکز سے
کم و بیش فاصلوں پر مادہ حلقوں کی صورت میں جمع ہونے لگا۔ یہی حلقے کچھ دن
بعد سیّارے بن گئے۔ ہماری اس سنگین زمین کی جگہ اس وقت ایک نیم مائع سے
مادہ کا ایک حلقہ تھا۔ رفتہ رفتہ لاانتہا مدت کے بعد یہ حلقہ ایک طرف سے سخت
اور دوسری طرف سے اور بھی رقیق ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بیچ میں سے شق ہو گیا۔
اور پھر اس قانون کے موافق جس سے فضائے محیط میں مائع مادہ متشکّل ہوتا ہے
کروی صورت اختیار کرنے لگا۔ یہ عمل برابر جاری رہا۔ آخر مادے میں لزوج
پیدا ہؤا اور ذروں میں چسپیدگی بڑھی۔ کرے نے ایک معین مدار یا طریق الارض
حاصل کیا۔ اور اس راستے میں جو مادہ ابھی تک آس پاس پھیلا ہؤا تھا اس کو
کھینچ کر اپنا جزو بدن بنانے لگا۔ یہ حال اب بھی باقی ہے۔ کروڑہا کروڑ گردشیں
اور الٹے پلٹے کھانے کے بعد ان مختلف طاقتوں اور عملوں نے اس کو وہ صورت
دیدی جو موجودہ علم طبقات الارض کے مطابق کرۂ زمین کی سب سے پہلی جامد صورت خیال
کی جاتی ہے۔ اور اسی سے اس علم کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف
انقلابات اور آہستہ آہستہ زمین کے اوپر کے پرتوں کی ساخت آثار
حیات کا ابتدائی ظہور۔ اس کی باقاعدہ ترقی۔ اور اس بچپن کے زمانے سے
اس جوانی کی حالت تک پہنچنے کی مفصل کیفیت سنانا علم طبقات الارض کا حق ہے۔
یہ تمام مختلف انقلاب مسئلۂ ارتقا کی ایک مثال تھے کرۂ زمین کے یکبارگی پیدا
ہو جانے کے بجائے اس کی نہایت دھیمی اور باقاعدہ نشو و نما کا خیال زیادہ
دل نشین ہوتا جاتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جو شان ایزدی اور قدرت خالقی اس
باترتیب صنعتگری سے نمایاں ہے۔ وہ دم بھر میں پیدا کر دینے کے خیال سے
ظاہر نہیں ہوتی۔ غور کریں تو صرف اس ایک کرے کی پیدائش کی امتداد مدت
ہی اس صانع کے ازلی اور ابدی ہونے کی گواہ ہے۔ اور پھر جب ان دوسرے

کروڑوں کروں کی طرف خیال کریں۔ جن میں سے ایک سورج زمین سے ڈھائی لاکھ گنا بڑا ہے۔ اور ایک سہیل سورج سے دس ہزار گنا بڑا ہے۔ جن کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ان میں سے بعض ستاروں کی روشنی ایک لاکھ چوراسی ہزار ۲ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی گھنٹوں اور دنوں میں کیا مہینوں اور برسوں میں بھی زمین تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ صدہا اور ہزارہا سال چاہتی ہے۔ اگر ان کی پیدائش اور آفرینش کا تصور کریں تو کثرت وسعت کی وجہ سے انسانی دل و دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ اور خیال کا برق رفتار قاصد ایک قدم بھی نہیں چل سکتا سُبْحَانَ اللہ۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ عالم حیوانات و نباتات ہی قوانین قدرت کے زیر اثر نہیں ہیں۔ بلکہ خود کرۂ زمین بھی انہی کا آوردہ ہے۔

اس طرح اگر مادی دنیا سے عالم خیال کی طرف چلیں تو یہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ترقیات دماغی بھی جانوروں کی طرح ابتدائی حالت سے انتہائی صورت یا جرم سے جسم کی طرف ترقی کر رہی ہیں۔ چنانچہ انسانی زبان کا ہم پہلے بھی ذکر کہہ چکے ہیں۔ اس کی تاریخ بھی وہی ارتقا کی داستان ہے۔ تعجب ہے۔ کہ ڈارون نے جو نقشہ آثار حیات کی وجہ اختلاف واضح کرنے کے لئے بنایا تھا۔ علم الالسنہ کی تشریح کے لئے ایسا موزوں ہے گویا ڈارون کی تمام کشش و کوشش اور سارا مطالعہ اور مشاہدہ اسی کے لئے وقف تھا۔ اور وہ نقشہ اسی کے واسطے بنایا گیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کے مسائل انقلاب بعینہ مشابہ ہیں۔ ناموں کا فرق ہے۔ اور سب کچھ وہی ہے۔ وہاں ایک طرح کے حیوانات بڑھتے بڑھتے الگ الگ اقسام بن جاتے تھے۔ یہاں ایک اصل کے الفاظ بدلتے بدلتے جدا جدا بولیاں بن جاتی ہیں۔ جس طرح وہاں صرف طاقتور اور زبردست قسمیں باقی رہ کر نوعیں بن جاتی تھیں اور باقی معدوم ہو جاتی تھیں۔ ویسے ہی یہاں بھی زیادہ پسندیدہ اور مناسب بولیاں قائم رہ کر زبانیں بن جاتی ہیں اور باقی مٹ جاتی ہیں۔ اور یہی حال اب تک باقی ہے۔ دنیا کی مروّجہ زبانوں کو دیکھیں تو وہی کشاکش ہستی۔ وہی انتخاب قدرتی۔ اور وہی ابقائے بہتر بن کے قانون جاری ہیں۔

Marfat.com

زبان ہی پر کیا منحصر ہے۔ نوع انسان کے تمام آئین جو حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ انہیں کی ایک نہایت عمدہ مثال طرز حکومت ہی ہے۔ جس کسی نے حکومت کی تاریخ پر غور کیا ہے۔ اسے اس کی۔ پیدائش۔ بچپن۔ طفلی۔ جوانی وغیرہ سب مدارج نظر آتے ہیں۔ یقیناً ایک زمانہ تھا۔ جب دنیا میں کوئی حکومت نہ تھی۔ ایک زمانہ ہے کہ حکومت اپنا جوبن دکھا رہی ہے۔ اس لئے ایک وقت درمیان میں ہونا ضروری ہے۔ جب حکومت پیدا ہوئی۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ دفعتاً کسی جادوگر کی انگلی کے اشارے سے پیدا نہیں ہوئی اس کا بھی ایک بیج یا جرم تھا۔ پھر اس کا جنین بنا۔ اور آخر ولادت کا وقت آیا۔ پھر شیر خواری۔ بچپن اور طفلی کا زمانہ رہا۔ آخر لڑکپن گزرا اور جوانی آئی۔ غرض جس پہلو سے دیکھیں حکومت کی نشوونما بھی انسانی کاروبار کی تاریخ میں ایک نمایاں اور اہم مضمون ہے۔ لیکن اس کی ٹھیک چھان بین کرنے کے لئے معلومات کا ذخیرہ وسیع اور باریک بینی اور معاملہ فہمی کا پایہ بلند ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے ان حالات و خیالات کو معلوم کرنا چاہیئے۔ جن میں حکومت کی ابتدا ہوئی۔ ضرور کوئی قوم ہوگی۔ جس نے انتظام و ترتیب کی خوبیاں اپنے بھائی بندوں سے کسی قدر پہلے دریافت کر لی ہونگی۔ شروع شروع میں امتحان کے طور پر طرح طرح کے تجربے کئے گئے ہونگے۔ ان ابتدائی تجربوں میں طاقت عقل اور بزرگی کا لحاظ ہوگا۔ مثلاً کہیں محض ایک گھرانے کا بزرگ تمام خاندان یا قبیلے کا بزرگ بن گیا ہوگا۔ کہیں محض جسمانی طاقت وجہ فضیلت ہوئی ہوگی۔ ایک قوی بازو شخص نے اپنے کمزور ہمسائے سے اپنا کام جبراً لیا ہوگا۔ اور خود اپنے سے زیادہ طاقتور شخص کا کام کیا ہوگا۔ اسی طرح سب سے زیادہ طاقتور شخص تمام گاؤں یا قبیلے کا سردار بن گیا ہوگا۔ کمزوروں نے اس جسمانی طاقت کے مقابلے میں دماغی قوت سے کام لیا ہوگا۔ اور آپس میں عقلیں لڑا کر عقل کو زور سے لڑایا ہوگا۔ اور اس طرح ظلم

Marfat.com

وستم سے بچاؤ کے لئے جبری حکومت کو عقلی کاروائیوں سے محدود اور مقیّد کیا ہوگا۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کا کوئی تحریری ثبوت یا عملی دلیل ملنی مشکل ہے۔ لیکن آیندہ کے تاریخی واقعات جو ہماری نظر کے سامنے ہیں ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا قیاس صحّت کے بہت قریب ہے۔ بہرحال جب ایک دفعہ حکومت کی بنیاد پڑ گئی تو پھر حالات کے انقلاب اور حاکم و محکوم کے تغیر و تبدل سے جانداروں کی طرح اس میں بھی ادل بدل ہوتا رہا ہوگا۔ بہتیرے امتحانی طریقے ناکام رہے ہونگے۔ جو کیفیات ملک و قوم کے مناسب ہونگے۔ انہوں نے پھیلنا اور بڑھنا شروع کیا ہوگا۔ اور پھر ان منتخب اور مستحب طرزوں کے اختلاف وافتراق سے نئی نئی صورتیں بنی ہونگی۔ یہاں تک کہ آفتاب تاریخ کے طلوع ہوتے ہی ایک طرف مصر کی مذہبی حکومت نظر آتی ہے۔ ایک طرف بابل اور نینوا کی شخصی سلطنت ملتی ہے۔ یونان میں بزرگان قوم برسر اقتدار ہیں۔ روما میں عوام النّاس صاحب اختیار ہیں۔ یہاں بھی کشاکش ہستی اور البقاء بہترین کا اصول جاری ہے۔ کہیں یہ بہترین صورت موروثی حکومت ہے۔ کہیں فوجی طاقت۔ آخر یہ بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور ایک افراتفری کا عالم اور نفسی نفسی کا نقشہ ہو جاتا ہے۔ جو خود کچھ بھی نہیں مگر بن سب کچھ سکتا ہے۔ اس ہیں سے نکل کر ایک طرف بابل اور نینوا کی حکومت اور پاپاؤں اور اسقفوں کی سلطنت ہوتی ہے۔ ایک طرف شہسواران جنگی کا زور ہوتا ہے۔ کہیں مطلق العنانی کا رواج ہوتا ہے۔ کہیں حکومت کے سر پر آئین و قوانین کا تاج ہوتا ہے۔ مدتوں تک یہی رنگ رہتا ہے۔ آخر ایک کا عروج اور ایک کا زوال ہوتا ہے۔ ایک میں ہبوط۔ اور ایک کو کمال ہوتا ہے۔ ارتقا کے اثر سے اہل ملک خود ایک بڑا طاقتور جزو بن جاتے ہیں۔ اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اور ان میں اور شخصی سلطنت میں ہستی کے لئے کشاکش ہوتی ہے۔ پھر خود عوام کی طاقت کے بہت سے فرقے ہوتے ہیں۔ کوئی نوع انسان کی ہم قومیت اور اتفاق بین الاقوام پر زور دیتا ہے۔ کوئی اشتراک عامہ کا مدعی ہوکر تمام ذاتیات کو ظلم اور ساری چیزوں کو مکمل نوع انسان کا حق ٹھہراتا ہے۔

غرض یہ کشاکش یونہی رہیگی۔ بعض اسباب موجودہ طرز حکومت کے موافق ہونگے۔ بعض مخالف۔ حکومت کچھ نئے انداز لیگی کچھ پرانے طریقے چھوڑیگی۔ مطلب یہ کہ طرز حکومت بھی افراد حیوانی کی طرح جب سے ہے انقلاب حالات وخیالات سے متغیر و متبدل ہوتی رہی ہے۔ اور جب تک رہیگی ہوتی رہیگی۔ گویا یہ بھی زبان کی طرح ارتقا کے وسیع قانون سے متاثر ہوتی ہے +

قانون کو ہی لیجیئے۔ قانون سے ہماری مراد وہ تمام اصول ہیں جو عقل صحیح نے معاشرت کی بہبودی کے لئے دریافت کئے ہیں۔ یہ بھی ارتقا کی ایک نمایاں مثال ہے۔ قانون وضع نہیں کیا گیا یعنی اسے انسانی عقل وخرد نے نہیں بنایا۔ بلکہ یہ خود ایک طاقت ہے جو انسانی دل ودماغ میں ایسے خیالات پیدا کرتی ہے۔ جن سے اس کے چال چلن میں خوبی اور اس کے کاروبار میں خوش اسلوبی زیادہ ہو۔ مثلاً آئین روما کو لیں۔ ان کی ابتدا کون بتا سکتا ہے ان کا آغاز کس کو معلوم ہے۔ روما روما نہ بنا تھا۔ مگر وہ موجود تھے۔ وہاں کے دس قانون بنانے والے ان کے بنانے والے نہ تھے۔ صرف لکھنے والے تھے۔ وہ مقنن نہ تھے محرر تھے۔ انہوں نے آیندہ نسلوں کے لئے قانون کو دس حصوں میں محدود کرنا چاہا تھا۔ مگر یہ بھی نہ ہوسکا۔ قاعدے دس کی جگہ بارہ ہو گئے۔ جمہوری سلطنت کے ابتدائی قانون عروج کے زمانے میں کام نہ دے سکے۔ اور عروج کے زمانے کے قاعدے شخصی سلطنت کے لئے کافی نہ ہوسکے۔ جو لوگ مقنن کہلاتے ہیں وہ قانونوں کو لفظی صورت میں ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا اصل مضمون پیدا کرنے والے نہیں ہوتے۔ آیندہ نسلوں کے لئے قانون ایجاد نہیں کئے جاتے۔ تحریر کئے جاتے ہیں۔ کام صرف یہ ہے کہ مردہ اور بیمار قاعدوں کو جوان اور تندرست قاعدوں سے الگ کریں۔ اور کشاکش ہستی میں غالب اور مغلوب قسموں کو جدا جدا کریں۔ غرض قانون بھی حکومت اور زبان کی طرح قدرتی انتخاب اور ابقائے بہترین کے زیر اثر ہے۔ کیونکہ وہی قاعدے قانون کہلائے جا سکتے ہیں۔ جو طرح طرح کے انقلابوں سے بچ نکلے ہیں اور اب تک معاشرت انسانی کے لئے مفید اور

موزوں ہیں۔ معاشرت، انسانی خود بھی انہی طاقتوں کا نتیجہ ہے۔ تمدن کس نے پیدا کیا۔ خود آدمی نے تو ہرگز نہیں بنایا۔ تمدن انسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ ساتھ ہی بڑھا اور ساتھ ہی پھلا پھولا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمدن اور معاشرت انسانی کاروبار کی بنیاد ہے۔ چونکہ ایک زمانہ تھا کہ تمدن نہ تھا۔ اور اب ہے۔ اس لئے اس کی پیدائش اور نشوونما بھی ضرور ہوئی ہو گی۔ اور قیاس غالب بلکہ یقین ہے کہ اس کی ترقی بھی بالکل افراد حیوانی کی طرح ہوئی ہو گی۔ ابتدائی طرز معاشرت کی مختلف صورتیں ہونگی ان میں سے کمزور اور نامناسب مٹتی گئی ہونگی اور قوی اور موزون بڑھتی ہونگی اور آئندہ زمانے کے ساتھ ترقی کرتی گئی ہونگی۔ غرض یہاں بھی وہی قدرتی انتخاب اور بقائے بہترین کارفرما ہیں۔ غالباً معاشرت اور تمدن کا اصل اصول تعلق زناشوئی ہے۔ علم تاریخ اور علم الاقوام میں مناکحت کی رسمیں سب سے پہلے ملتی ہیں۔ مگر یہ بھی ارتقا پر کاربند رہی ہیں۔ اگرچہ اس کے ابتدائی مسائل اچھی طرح صاف اور واضح نہیں ہیں مگر قیاس یہ ہے کہ ابتداً انسان میں بھی توالد و تناسل کا عمل دیگر حیوانات کی طرح کسی رسم اور قاعدے کا پابند نہ ہو گا۔ اس کے بعد پہلے تعددِ بعول اور پھر تعدد ازواج کا رواج ہوا۔ اور اب عموماً ایک ہی شادی کا قاعدہ جاری ہے۔ آج کل شاید تعدد بعول پر تعجب کیا جائے۔ لیکن تقریباً تمام قوموں میں شروع شروع میں یہ رسم رائج رہی ہے۔ اس میں گویا عورت کو نسل افزائی کا ذریعہ قرار دے کر اسے قبیلے کا مرکز بنا دیا تھا۔ اور باپ کی خصوصیت نہ ہونے سے بچہ گویا تمام خاندان کا بچہ ہوتا تھا۔ عبرانی پیغمبروں کے زمانے تک اس کے قواعد جاری تھے۔ مثلاً کسی کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ سے توالد و تناسل کا جاری رکھنا اس کے بھائیوں کا حق ہی نہ تھا بلکہ فرض تھا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ طریقہ منسوخ ہو گیا۔ اور اس کی جگہ تعدد ازدواج کا رواج ہوا۔ جو اب بھی کم کم جاری ہے۔ اس میں اولاد کا تعلق محض باپ ہی سے ہوتا ہے۔ گویا وہ مرکز ہے اور عورتیں اس کے ارد گرد حلقہ باندھے کھڑی ہیں۔ شادی کے بعد عورتوں کی ذاتیت اور قومیت مٹ جاتی ہے۔ اور

Marfat.com

بچے صرف اپنے باپ کے خاندان کا جزو ہوتے ہیں۔ اب ارتقا نے ایک ہی شادی کو زیادہ مروج کر رکھا ہے۔ مگر مرد کو اس میں بھی ابھی تک فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ مال و اسباب کا انتظام اور بال بچوں کی تربیت کا کام اسی کے سپرد ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اولاد پکاری بھی اسی کے نام سے جاتی ہے۔ گویا آیندہ اور گزشتہ کا رابطہ اور اخلاف و اسلاف کا واسطہ مرد ہی ہوتا ہے۔ اور عورت کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ ممکن ہے کہ ارتقا سے اس رسم میں بھی انقلاب پیدا ہو جائے اور جس طرح زن و مرد دونوں بچوں کی پیدائش میں شریک ہیں۔ اسی طرح اولاد کے نام میں بھی دونوں کا اشتراک ہو جائے +

صنائع انسانی پر بھی یہی قانون ارتقا حاوی ہے۔ تمام ہنر ایک ہی اصل سے نکل کر اسی قانون کے مطابق بڑھے ہیں۔ دو تین برس کے بچے کو دیکھو کہ کیونکر جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ نقاشی بھی ایک قدرتی خواہش ہے اور بچوں کی بنائی ہوئی کتے بلی کی مورتیں اس فن کا بچپن دکھاتی ہیں۔ تاریخ کے ابتدائی دفینوں پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ایسی ہی مٹی کی بھدی مورتیں اور ٹیڑھی بیڑھی صورتیں ملتی ہیں جن کے بنانے والے وہ ابتدائی لوگ تھے جن کا اب نام تک مٹ چکا ہے۔ یہ صورتیں وہی ہیں جن کی آج ہر ایک بچہ اپنے بچپن میں نقل اتارتا ہے۔ مگر بچے جلدی ہی بڑے ہو جاتے ہیں اور عموماً اس مصوری کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو آدمی فطرتاً اس فن کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ زیادہ خوبصورتی اور نزاکت کے ساتھ اس کو از سر نو سیکھتے اور بار دیگر اس کی مشق کرتے ہیں۔ افراد کی زندگی کے لحاظ سے یہ زمانہ فن کا لڑکپن ہوتا ہے۔ آخر جوانی آتی ہے۔ اور اس کا نمونہ کسی عظیم الشان نمائش تصاویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نوع کی زندگی کے لحاظ سے بھی فن کی نشو و نما اسی طرح ہوتی ہے۔ آیندہ کے نمونے ان بھدی مورتوں اور ٹیڑھی ٹیڑھی صورتوں سے جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ترقی کرتے کرتے زیادہ صفائی اور خوبصورتی حاصل کرتے جاتے ہیں

بعض محاسن کچھ دن محاسن سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر قبائح بن جاتے ہیں۔ اور چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ مصوّر مشہور ہوتے ہیں۔ اور پھر بھلا دئے جاتے ہیں۔ صرف چند برگزیدہ نام اور چند پسندیدہ کام ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ اور فن صورت نگاری بھی ابقائے بہترین کے اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ بعینہ یہی حال اور علوم و فنون کا بھی ہے۔ ان میں سے کوئی علم یا کوئی فن دفعتاً پیدا نہیں ہوا۔ ابتدائی انسان نے کسی ہنر کو بھی مکمل نہیں پایا۔ کوئی کمال بھی بنا بنایا ہاتھ نہیں آیا۔ سب کے سب آہستہ آہستہ بڑی دقتوں اور محنتوں کے بعد مختلف انقلابوں اور انتخابوں کے پیچھے موجودہ رتبۂ کمال تک پہنچے ہیں۔ اور ابھی آئندہ کا لا انتہا زمانہ سامنے پڑا ہے۔ علوم ادبیہ کا بھی یہی نقشہ ہے یہ بھی بنی آدم کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور بڑھے ہیں۔ ابتدائی آدمیوں کے ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ فقرے اور بھدے بھدے بے تلے لفظ ان تمام نظم و نثر کے طومار کی اصل تھے۔ جن پر آج ایک ایک قوم الگ الگ ناز کرتی ہے۔ اس میں بھی وہی قانون قدرت اپنی کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرتے رہے ہیں۔ اگر اس وقت ان تمام کتابوں اور تصنیفوں کو یکجا کر دیا جائے۔ جو قدرتی انتخاب کے ظالمانہ ہاتھوں سے برباد ہو چکی ہیں۔ تو جنگل اور میدان ان کے لئے تنگ ہوں۔ اور آدمی ان بے انتہا انسانی کوششوں کو یوں رائگاں جاتے ہوئے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے۔ کہ جو کچھ بچا ہے وہ اس مجموعے سے زیادہ قیمتی اور گویا اس کا عطر ہے۔ کوئی عمدہ کتاب یا قابل قدر نظم ایک شخص کا کام نہیں ہوتی۔ بلکہ ملک کے اس تمام زمانے کے خیالات کا نچوڑ اور ترقیوں کا ست ہوتا ہے۔ خود علم تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔ اور علم تاریخ کی کیا خصوصیت ہے ہر شے کا یہی حال ہے اگر اس قانون کی مثالیں لکھنا چاہیں تو دفتروں میں ختم نہ ہوں۔ خود انسانی خیال اور تصوّر ہی اس کی مثال ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خیال مادی اسباب سے پیدا ہوا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسانی قوت متخیلہ بھی ارتقا سے ہی اس درجے تک پہنچی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہمارے وحشی بزرگ تقریباً کچھ بھی

تصوّر نہ کر سکتے تھے۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ انسانیت گویا اسی ایک قوت پر مبنی ہے۔ اس قوت کے نزدیک نزدیک و دور یکساں قریب ہیں اور پست و بلند بالکل ہموار ہیں۔ اس کی بلند پروازی کے سامنے آسمان کی اونچائی بے معنی اور سمندر کی گہرائی پانی پانی ہے۔ اس کی تیزروی کے مقابلے بجلی گرد اور روشنی کا دم سرد ہے۔ کون سی مسافت ہے جو اس نے نہیں پائی۔ کونسا راز ہے جو اس نے نہیں بھانپا۔ فضاے محیط کا میدان اس کی جولانی کے لئے تنگ ہے قدرت کی نیرنگی اس کی معاملہ فہمی سے بیرنگ ہے۔ اس کی ایک دوڑ میں زمین سے آسمان تک کے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور اس کی ایک اڑان میں ثرا سے ثریّا تک کے حال کھل جاتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اگر انسان کو خدا تک پہنچانے والی کوئی چیز ہے تو یہی ہے۔ مگر تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ بھی ہمیشہ یونہی نہیں تھا۔ ابتدائی آدمی فہم و قیاس سے معرّا۔ اور متخیّلہ و متصوّرہ سے مبرا تھے۔ مگرانہی میں مصری۔ یونانی۔ ہندی۔ پارسی۔ رومی اور عربی مسلمان۔ یہودی اور مسیحی۔ انگریز۔ روسی اور جاپانی غرض تمام دنیا کی قوموں کی طاقتیں مضمر تھیں۔ کچھ نہ تھے۔ مگر سب کچھ تھے۔ آخر ایک وقت آیا کہ انسان میں فکر کی طاقت شروع ہوئی۔ فہم و قیاس پیدا ہوے تخیّل اور تصوّر کا ظہور ہؤا۔ اور تمام قواے دماغی نے کھلنا شروع کیا۔ مگر یہ سب کچھ یکایک نہیں ہؤا۔ انسان دم بھر میں نبی۔ شاعر اور فلسفی نہیں بنا۔ ایک ہی پشت میں علم الاشیا حاصل نہیں ہؤا۔ خیال نے بھی دنیا کی اور تمام چیزوں کی طرح آہستہ آہستہ بتدریج ترقّی کرنی شروع کی۔ اور موجودہ قوت خیال ان تمام بے انتہا عمروں کا عطر ہے۔ اسے بھی قدرتی انتخاب نے ابقاے بہترین کی آگ میں صاف کیا ہے۔ اور ابھی یہ صرف وہ حصّہ ہے جو ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ جو قوتیں دماغ میں چھپی ہوئی ہیں۔ یا ابھی تک ظاہر نہیں ہوئیں ان کا علم عالم الغیب کو ہے۔ ان پر بحث کرنا نہ ہمارا کام ہے نہ ہمارے لئے ممکن ہے +

جس طرح مادی اجسام کے لئے ظاہری حالات سے مناسبت ضروری ہے اسی طرح قواے دماغی کے واسطے بھی بیرونی کیفیات سے مطابقت لازمی ہے

Marfat.com

اختلاف حالات سے قوائے دماغی بھی ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ عقل وخرد کی بھی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جن میں سے اچھی صورتیں قائم رہتی ہیں اور کم درجے کی صورتیں مٹ جاتی ہیں۔ مثلاً ابتدائے تاریخ میں ایک زمانہ تھا کہ تمام انسان افسانوں کے دلدادہ تھے۔ اور سب نے اپنے عقائد کو کہانیوں کی صورت دے رکھی تھی۔ اس کے بعد تکمیل فن کا زمانہ آیا۔ جس کی مثال اہل یونان ہیں۔ چند دن میں لوگوں کو ترتیب۔ باقاعدگی اور حکومت کا خیال آیا اور اس نے علوم و فنون کا بازار ٹھنڈا کر دیا۔ کسی زمانے میں ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا زور رہا ہے۔ کسی زمانے میں وحشیانہ رسوم کا رواج ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ علوم عقلی اور مسائل منطقی کا شہرہ تھا۔ آج کل عملی ترقی اور علوم طبیعی کے سر سہرا ہے۔ غرض عالم حیوانات کی طرح انسانی ترقی دماغی کی بھی قسمیں اور نوعیں ہیں۔ اس کو بھی کشاکش ہستی میں سینکڑوں مخالف طاقتوں سے جان بچانی ہوتی ہے۔ جانوروں کے لئے آب وہوا کی ناموافقت اور اپنے بیگانے سے دائمی مجادلت باعث خطر تھی۔ ترقی دماغی کے لئے شکوک و شبہات کی پھسلن اور پرانے مسائل و معتقدات سے ان بن کافی سد راہ ہے۔ امید ایک طرف کھینچتی ہے۔ خوف دوسری طرف لے جاتا ہے۔ غم اور خوشی۔ رنج اور راحت موجودہ سے بیزاری اور معدوم کی امیدواری۔ رازجوئی اور عالی خیالی۔ غرض موت اور زندگی کی تمام حالتوں نے ترقی دماغ پر اپنا مفید یا مضر اثر دکھایا ہے۔ اور طرح طرح کے تغیر و تبدل کے بعد اس کی یہ موجودہ صورت پیدا کر دی ہے۔

اخلاقی حالت کی سرحد بھی دماغی قوت سے لگی ہوئی ہے۔ نہ اس کے وجود سے انکار ہو سکتا ہے۔ نہ اس کے مختلف مدارج ترقی کی تردید کی جا سکتی ہے۔ وسط افریقہ اور وادی امیزان میں ابھی تک ایسی قومیں آباد ہیں جن میں اخلاقی حالت النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ مہذب ملکوں میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جن کی اخلاقی طاقت تمام قوائے اور جذبات پر مسلط اور محیط ہے ضمیر کی آواز وحشیانہ اقوام میں عموماً نہایت پست اور کمزور۔ اور اسفل درجے

کی قوموں میں انتہا درجے کی بلند اور سوبلی ہوتی ہے۔ نیکی اور بدی کا معیار یہی ہے۔ ظلم اور انصاف۔ دنائت اور شرافت۔ خست اور سخاوت۔ پست فطرتی اور عالی ہمتی۔ گنہگاری اور نکوکاری کے تمام درمیانی مدارج اسی سے معلوم ہوئے ہیں۔ اور اسی سے قائم ہیں۔ مگر اس کی موجودہ وقعت کے ساتھ ہی اس ہولناک کشاکش کا بھی خیال کرنا چاہیئے جو ضمیر کو ترقی کے راستے میں پیش آئی ہے۔ کونسی محنت اور مصیبت تھی جو اس نے نہیں جھیلی۔ کون سا امتحان یا ابتلا تھا جس میں یہ مبتلا نہ ہوئی۔ دنیا کے بے انتہا مذہب اور ہر ایک مذہب کے لا محدود فرقے اور ہر ایک فرقے کے بے شمار اختلافات اس بات کے شاہد ہیں۔ ضمیر بھی بیرونی کیفیات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے۔ جوں جوں کوئی قوم وحشیانہ حالت سے شائستگی اور تہذیب کی طرف بڑھتی گئی۔ اسی نسبت سے اخلاقی حالت بھی ترقی کرتی گئی اور اس کا معیار زیادہ سخت اور زیادہ عمدہ ہوتا گیا۔ جب توحش کم ہؤا تو دیانت داری اور انصاف کی ضرورت ہوئی۔ تمدن و معاشرت کی ابتدا ہوئی تو عفت وعصمت کی حاجت پڑی۔ جسمانی اور دماغی حالت کی بہتری کے ساتھ راست بازی۔ غیرت۔ خودداری وغیرہ خوبیاں بڑھیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ اخلاقی حالت میں بھی وہی کشاکش ہستی وہی اختلاف انواع واقسام اور وہی ابقائے بہترین کے اصول موثر اور کارگر ہیں +

سب سے آخر میں ہر فرد بشر خود ہی ایک بقیہ نتیجہ اور ارتقا کی ایک مثال ہے پرانے زمانے میں ہر ایک آدمی خود ایک مسبب الاسباب اور ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ بظاہر تمام واقعات۔ تمام حالات اس کی ارادے اور اس کے عزم پر مبنی تھے۔ زندگی کے سارے ساز وسامان انسان کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھے۔ اسی لحاظ سے آدمی تمام اشیا پر مقدم اور مفتخر تھا۔ شہروں کا بنانے والا۔ جنگلوں کا بسانے والا۔ نہروں کا نکالنے والا۔ ملکوں کو سنبھالنے والا وہی تھا۔ علم وہنر کا بانی۔ بحر و بر پر لاثانی۔ زمین پیرا۔ آسمان پیما وہی تھا۔ مگر حال میں قوانین قدرت کے راز کھلتے جاتے ہیں اور انسان کارخانہ بدلتا جاتا ہے۔ اب مسبب الاسباب ہونے کی بجائے وہ خود اسباب

Marfat.com

کا آوردہ۔ اور خود طاقت ہونے کی جگہ اور طاقتوں کا پیدا کردہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کی قوت فاعلہ میں کچھ کمی ہوگئی ہے۔ یا وہ فاعل مختار نہیں رہا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود گزشتہ اور موجودہ حالات کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ خود ان حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہے۔ جو اس کی ہستی سے صدیوں پہلے سے کارفرما تھے۔ ان تمام طاقتوں نے متفق اور متحد ہوکر ہر فرد بشر کو وہ بنادیا جو کچھ کہ وہ ہے۔ اگرچہ ایک خاص حد تک اس کی ذہنی اور دماغی طاقتیں اسی کے قبضے میں ہیں اور وہ خود فاعل مختار ہے۔ اگرچہ ایک درجے تک کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس کے قوائے پر اُس کے ارادے کے سوا اور کسی بالائی قوت کا اثر نہیں۔ اور اس کو اپنے حالات و خیالات پر اختیار ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہر ایک آدمی ایک زمانے کا نتیجہ اور ایک عمر کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک ماں باپ کا بچہ نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام آدمیوں کا بیٹا ہے۔ جو اس کے خاندان میں ابتدائے آدم سے اس وقت تک گزر چکے ہیں۔ یہ بات ہر فرد بشر کے حق میں درست ہے کہ وہ وہی بن سکتا ہے۔ جو اس کے ماں باپ۔ حسب نسب اعزا و اقربا۔ تعلیم و تربیت اور موافقت وقت نے اسے بنادیا ہے کوئی شخص اپنی قومیت نہیں بدل سکتا۔ کوئی آدمی اپنی خوشی سے کسی خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔ کسی انسان نے اپنے قبیلے کا نام اور کام خود مقرر نہیں کیا۔ جو بےبسی اصل و نسل بدلنے میں ہے۔ وہی بیچارگی ان حالات کے تغیر میں بھی ہے۔ جو اس شخص کا رتبہ اور درجہ مقرر کرنے والے ہیں۔ ایک بچہ وسط افریقہ کے حبشی کی جھونپڑی میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک بچہ شاہ جرمنی کے پرشوکت محل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک آدمی اسکیمو کے برفانی گھر میں دنیا میں آتا ہے۔ ایک آدمی اصفہان کے ایرانی قالینوں پر ہوتا ہے۔ کوئی ناپیدا کنار صحرا میں اونٹ کے ڈگمگاتے ہوئے کجاوے میں ہوتا ہے۔ کوئی سلطنت برطانیہ کے رات دن گونجتے اور گرجتے ہوئے دارالخلافے میں جنم لیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں انسان بالکل ہی ناچار اور بے اختیار ہے۔ ریت کا ایک ذرہ ہے کہ ہوائیں اسے جدھر چاہتی ہیں اڑائے لئے جاتی ہیں۔ گھاس کا ایک پتہ ہے کہ بحر مواج کی لہریں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بہائے

لئے پھرتی ہیں۔ اسی طرح حالات مابعد بھی مقرر ہوتے ہیں۔ خود اختیاری نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ شاعر مادرزاد شاعر ہوتے ہیں۔ بجا۔ لیکن اگر زمانہ موافق نہ ہو تو پھر؟ اگر پہلے حالات مدد نہ کریں تو پھر؟ اگر اس کی زبان کی وسعت اجازت نہ دے تو پھر؟ اگر جسمانی صحت یا مخالف واقعات روک دیں تو پھر؟ کہتے ہیں کہ تیمور اور نپولین ماں کے پیٹ ہی سے ایسے اولوالعزم اور عالی ہمت پیدا ہوئے تھے۔ ٹھیک۔ لیکن زمانہ امن میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔ غیر قوم میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔ مدبر اور مقنن۔ ادیب اور فلسفی۔ سب اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات کے ممنون ہیں۔ اپنے زمانے کے رسم و رواج اور حالات و خیالات کے احسان مند ہیں۔ نہیں بلکہ خود اپنی طاقتوں کی ترقی اور تکمیل کے لئے کسی اہم واقعے یا زبردست حادثے کے بھی محتاج ہیں۔ جب تک یہ سامان نہ ہوں تب تک ان کی تمام مادرزاد قوتیں بھی مل کر کچھ نہیں کر سکتیں ✦

ہم اس بحث پر بیجا زور اور مبالغہ آمیز طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر یہ بات کہ ہر فرد بشر مختلف واقعات کا آوردہ اور اپنے سے زیادہ زبردست اور قدیمی طاقتوں کا پیدا کردہ ہے۔ اتنی بدیہی اور ظاہری ہے کہ اس کے لئے دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔ جو حال افراد کا ہے۔ وہی ان کی قوموں اور نسلوں کا ہے۔ قومیں اور نسلیں بھی بیرونی طاقتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ یقینی صرف مقامی کیفیات تو قوموں کو نہیں بنا سکتیں۔ انسان کی اپنی طبیعت اور ارادے کا بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔ چیزیں ڈھالنے کے لئے سانچے تو بیشک ضروری ہیں۔ مگر ان سانچوں میں ڈالنے کے لئے کوئی مادّہ بھی تو ہونا چاہیئے۔ یہ کہنا بجا نہیں کہ اسکیمو منطقہ بارده کا اور بدوی نخلستان عرب کا۔ اور ہندوستانی وادی گنگا کا اور حبشی صحرائے افریقہ کا بنایا ہوا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان مقامی حالتوں کا اثر بھی انسانی خوبو پر بہت زبردست ہوتا ہے ✦

مختلف نسلوں نے اپنے طبعی میلان اور فطری رغبت کی وجہ سے خاص خاص پہلوؤں پر ترقی کی ہے۔ اور ان کا مابہ الامتیاز اثر نمایاں ہوتا ہے۔ آ

Marfat.com

قومیں قدرت کی محقق۔ اسباب کی متلاشی۔ دنیا کی فاتح اور علم و فن کی موجد تھیں۔ سمیا طیقی قومیں قدیم مذہبوں کی بانی۔ اور رسم و رواج کی مُبدع تھیں۔ اُنہوں نے قدرت کی گھٹا اور کائنات کے بادل کے پرے شان الٰہی اور جلال ایزدی کا مشاہدہ کیا اور اسی کے سامنے سر تسلیم جھکایا۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ انہی کے ایک گروہ نے تمام اقوام پیشین کے محاسن اس طرح جمع کر لئے جیسے پارہ سونے کے ذرّے تمام حشو و زوائد کو چھوڑ کر نکال لیتا ہے۔ حمیا طیقی لوگ ابتدائی زمانے کے معمار تھے۔ کہ مصر اور کلدان کے معابد و مقابر۔ محل اور اہرام آج تک زبان حال سے ان کے شاہد کمال ہیں +

باب چہاردہم

مسئلہ ارتقا پر چند اعتراض اور اُنکے جواب

گزشتہ باب میں ہم نے مسئلہ ارتقا کی چند نمایاں اور واضح مثالیں پیش کر دی ہیں۔ اگرچہ مسئلے کی اہمیت اور عمومیت کے لحاظ سے بہت کم ہیں۔ مگر پھر بھی انسان اور انسان کی متعلقہ اشیا کی طرز آفرینش اور اس مسئلے کا باہمی لگاؤ دکھانے کے لئے کافی ہیں۔ اور اب غالباً اس مسئلے کی زیادہ توضیح و تشریح کی حاجت نہ ہوگی۔ لیکن مضمون کو ختم کرنے سے پہلے چند عام اعتراضوں پر بھی غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو بعض اصحاب کے نزدیک اس مسئلے کی قبولیت کے اختیار کرنے میں مانع ہیں۔ اور اس پر اعتبار کرنے میں حائل ہیں +

پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ انسان کو ذلیل الاصل اور رذیل النسل قرار دے کر اس کے مطیع اور محکوم جانوروں کو اس کا ہم قوم اور ہمسر ٹھہراتا ہے۔ انسان باقی تمام حیوانات سے ممیز اور ممتاز ہے۔ اسی کو اپنی دماغی قوتوں

Marfat.com

اور روحانی طاقتوں پر ناز اور بجا ناز ہے۔ کیونکہ ان باتوں میں اعلٰے سے اعلٰے طبقے کے جانور اس کے ادنےٰ سے ادنےٰ نمونے سے بھی آنکھ نہیں ملا سکتے۔ اور کسی حیوان میں ان خوبیوں کا پرتو تک نہیں پڑا۔ انسان کی بزرگی اور شرافت طبعاً اس کو ان حیوانات لایعقل سے دور کھینچتی ہے۔ اور کسی ایسے خیال کو دل نشین نہیں ہونے دیتی جو اس درمیانی بُعد کو کم کرے۔ جب سے نوع انسان نے ہوش سنبھالا۔ اس نے یا تو جانوروں کو اپنا محکوم اور فرمانبردار پایا۔ یا اپنے سامنے مغلوب اور خوار دیکھا۔ اور اب انہی سے کوئی رشتہ جوڑنا یا ان کو اپنا ہم نسب خیال کرنا اس کی انانیت اور خودداری کے خلاف ہے چونکہ ارتقا کا اصول اس مشارکت اور مقاربت پر زور دیتا ہے۔ اس لئے فطرتاً مردود اور ناقابل قبول ہے +

اس اعتراض سے اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ غور سے دیکھنا چاہیئے کہ مسئلہ ارتقا کے مطابق یہ طبعی خیال خود بھی ایک ابتدائی جرم سے بن کر مختلف تغیرّ و تبدل کے بعد اس درجے تک پہنچا ہوگا۔ اگر اس کا جواب عقل صحیح کے مطابق مدلل ثبوت کے ساتھ دیا جائے۔ تب تو اس کا ذہن سے نکلنا ممکن ہوگا۔ ورنہ محال ہے۔ اس اعتراض کو پوری فراخ حوصلگی اور بے تعصبّی سے دیکھنا چاہیئے۔ تاریخ کو ان ذرا ذرا سے اعتراضوں اور چھوٹے چھوٹے عقیدوں سے کیا بحث ہے۔ یہ وہ تماشا ہے جسے صانع مطلق چاند اور سورج کی روشنی میں ساری دنیا کے آدمیوں سے کروا رہا ہے۔ جس کا ایک ایک نقط قدرت اپنے ہاتھ سے طبقات الارض کے ورقوں پر کندہ کرتی ہے۔ تاریخ کو سخن پروری اور طرف داری سے کیا سروکار۔ میزان عدل کسی طرف خواہ نخواہ نہیں جھکتی۔ اصلی تاریخ کذب و دروغ کے نام سے ناآشنا اور تعصب اور رو و رعایت کے مضمون سے ناواقف ہے (اور جو ایسی نہ ہو وہ تاریخ نہیں)۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض طبعی ہے۔ اور اس کا جواب ضروری۔ اس کے لئے دیکھنا یہ ہے کہ اس اعتراض میں حقیقت اور حقیت کہاں تک ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ

مناسب یہ ہے کہ ہم افرادِ انسانی کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ اس کی ابتدا تو نہایت پست اور بے وقعت ہے۔ ہر فردِ بشر کی ہستی کا آغاز مادے اور طاقت کے باہمی تاثیر اور تاثّر کے تاریک پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ کس اعتبار سے کہیں کہ انسان کی زندگی شروع ہو گئی۔ حالت تو یہ ہے کہ اس کا ابتدائی جرم نظر آنے کے لئے طاقتور خردبین کا محتاج ہے۔ اور مچھر اور چیونٹی سے بھی ہزاروں لاکھوں گنا چھوٹا ہے۔ یہ کچھ منطقیانہ بحث یا من گھڑت افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ روزمرہ کا ایک معمولی مشاہدہ ہے۔ جو سائنس کے نہایت معتبر آلات سے تحقیق کیا گیا ہے۔

اس سے آگے چلیں تو آگے بھی وہی کیفیت ہے۔ وجودِ انسانی کے ابتدائی مدارج بھی کسی طرح اور جانوروں کی اسی حالت سے ممتاز نہیں ہوتے۔ قدرت انسان کے بچّے کو بھی اسی سانچے میں ڈھالتی ہے۔ جس میں سے وہ اعلےٰ طبقے کے جانوروں کو نکالتی ہے۔ مغرور سے مغرور بادشاہ عقلمند سے عقلمند فلسفی بڑے سے بڑا حکیم آئے۔ اور اپنے بچّے کو کتّے کے پلّے اور مرغی کے چوزے سے تمیز کرلے۔ قدرت نے ابھی تک اسے اوروں سے ممتاز نہیں کیا۔ ابھی تک اس کی خصوصیت آئندہ انقلابات کی محتاج ہے۔ ابھی تک سائنس کی باریک سے باریک تحقیقات اس میں اور اَور جانوروں میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں پاتی۔ پھر جب امتیاز پیدا ہونے بھی لگتا ہے تو یکایک نہیں ہو جاتا۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ۔ اور بہت دقّت اور بہت دشواری سے۔ گویا قدرت کے نزدیک اس کی کچھ وقعت ہی نہیں۔ آخرکار انسانی جنین اور جانوروں سے الگ ہونے لگتا ہے۔ اور اور جانور اس سے جدا ہونے لگتے ہیں۔ ایک انسانیت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک فرسیت کی طرف ایک کلبیت کی طرف۔ غرض جب دنیا میں آنے کے دن بالکل سر پہ آجاتے ہیں۔ تو جنین بھی اپنے ماں باپ کی پوری صورت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ مگر پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد بھی عرصے تک آدمی کے بچے کی حالت نہایت ناقص اور نامکمل رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں نشوونما کی محتاج ہوتی

ہیں۔ عقل و تمیز کا تو نام بھی نہیں ہوتا۔ پیدائش کے وقت ادنےٰ درجے کے جانوروں کی سمجھ بوجھ اور عقل و تمیز نو پیدا شدہ انسانی بچے سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حال جسمانی طاقت کا بھی ہے۔ بچہ کھڑا ہونا اور چلنا کیا اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ غالباً دنیا کی تمام ذی حیات چیزوں میں انسان کا بچہ سب سے زیادہ بے کس اور بے بس ہوتا ہے۔ ع

مرغک از بیضہ بروں آید و روزی طلبد ✤ آدمی زادہ ندارد خرد و ہوش و تمیز

اس سے بھی آگے چلیں تو بچپن کی شروع کی حرکات بھی کسی آئندہ ترقی کی صاف شہادت نہیں دیتیں۔ اگر بچے کو چھوڑ دیا جائے تو وہ فضول ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عقل و تمیز کی ترقی تو نہایت ہی دھیمی اور آہستہ ہوتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ بچے کی ابتدائی دماغی حالت کتنی ادنےٰ اور پست ہے۔ مہینوں تک رونے کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوتی۔ اور یہ رونا بھی اور جانوروں اور پرندوں کی آواز سے کچھ علیحدہ نہیں ہوتا۔ گویائی کی ابتدا پر غور کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے فطرتاً دو حرفی لفظ منہ سے نکلتے ہیں۔ مگر ان محض مہمل اور بے معنی آوازوں کو لفظ کہنا صحیح نہیں۔ آخر خدا خدا کر کے بڑی مشکلوں سے ان آوازوں میں بعض الفاظ کی جھلک پڑتی ہے۔ کئی دن یہی حالت رہتی ہے۔ اور پھر ایک لفظ زبان پر چڑھتا ہے۔ مہینوں بعد ایک لفظ اور۔ اور پھر ہفتوں بعد ایک اور سبحان اللہ متنبی اور خاقانی کی نادر البیانی شیکسپیر اور ملٹن کی سخن رانی۔ اور سعدی اور حافظ کی شیریں زبانی کی کیا اچھی ابتدا اور کیا عمدہ آغاز ہے۔ اس حالت میں جسمانی حرکات و سکنات عقل حیوانی کی زیر اثر ہوتی ہیں۔ آخر برسوں میں بچّہ کو سیدھا کھڑا ہونا آتا ہے۔ ہنسنا۔ بولنا۔ اور تعجب یہ کہ محبت کرنا بھی آجاتا ہے۔ اب تمیز بھی آتی جاتی ہے۔ گویا اب تک حیوان تھا۔ اب انسان بنتا جاتا ہے۔ یہاں سے عقل کا کمال شروع ہوتا ہے۔ بچپن کی ضد اور لڑکپن کا کھیل کود گزر جاتا ہے۔ جوانی آتی ہے۔ ساتھ ہی جسمانی اور دماغی طاقتیں بھی جوان ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کتنے آدمی ہیں جو اس درجہ کمال تک صحیح سالم پہنچتے ہیں۔

Marfat.com

اور کتنے آدمی ہیں۔ جو غلطیوں کی پھسلنوں اور بداعمالیوں کی دلدلوں میں پھنسکر اپنی ناشدنی زندگی کے دن جانوروں کی طرح بسر کرتے ہیں۔

یہاں اس بیان سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ابتدائی حالت اور شروع کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ کوئی فرد بشر اپنی ابتدائے ہستی کی انتہائے پستی سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے ماننا پڑتا ہے کہ اس کی پیدائش اور جانوروں کی پیدائش سے مشابہ کیا معنی بعینہٖ یکساں ہوئی تھی۔ ہر عقلمند آدمی یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ایک وقت تھا۔ کہ اس کی زمین و آسمان کو گھیرنے والی طاقتیں اُنہیں کے ایک نہایت ہی چھوٹے ذرے میں بند تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ اپنی ماں کے رحم میں محض گوشت کا لوتھڑا تھا۔ جس میں عقل و تمیز کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ پھر جب وہ پیدا ہوا تو اس کی کمزوری اور نادانی کی کیا حالت تھی۔ اور بڑے ہونے پر بھی سال دو سال تک اس کی زندگی کس قدر جانورانہ تھی۔ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس میں اس سے بھی کم عقل تھی۔ جتنی ادنےٰ سے ادنےٰ اور حقیر سے حقیر کیڑے کے بچے میں ہوتی ہے۔ اگر اور لوگ اس پر جان قربان نہ کرتے اور دم نہ چھڑکتے تو یہ بچہ پروان نہ چڑھتا۔ اور یہ حیوان انسان نہ بنتا۔ مگر کیا یہ حقیر ابتدا اور مبتذل آغاز خفت و خجالت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ عقلمند آدمی کے لئے یہ انتہائے ترقی اور معراج کمال ہی سرمایۂ ناز اور موجب فخر ہے۔ کیا کوئی معقول پسند شخص اپنے کسی زمانے میں جنین اور شیر خوار ہونے پر شرمسار ہو سکتا ہے۔ یہ تو نہایت خوشی کی بات ہے کہ وہ جرم جس کو قدرت نے اور جانوروں سے مشابہ بنایا تھا نشو و نما کی ترقی سے کس حسن و جمال اور کس فضل و کمال تک پہنچا ہے۔ کہ تمام عالم اس کے زیر قدم ہے۔ زمین اور آسمان کے اسرار اس کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ بر و بحر کے نقشے اس کی نظر میں جمے ہوئے ہیں۔ تاروں بھرا آسمان اس کے سر پر چتر شاہی ہے۔ اور اس بیرونی مادی دنیا کے علاوہ خود اس کا دماغی اور روحانی عالم اس کے پاس ہے۔ خیال اور تصور۔ ارادہ اور عزم۔ ان کنجیوں سے بحر و بر اپنے جواہر اس کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ ان افسونوں

Marfat.com

سے فضائے محیط اپنے بھید اس کے سامنے کھول دیتی ہے۔ سان چلتے ہوئے جادوؤں سے بے انتہا گزرے ہوئے وقت اور لامحدود آنے والے زمانے اپنے رموز اسے بتا دیتے ہیں +

پس جب ہر فرد بشر کی یہ کیفیت ہے تو نوع کی آفرینش پر اعتراض کیوں ہو۔ اگر نوع کی محض بخیال خود کم نسبی باعث ننگ ہے تو ہر فرد کی اپنی ابتدائے ہستی کی پستی سے بوجہ اولے عار ہونا چاہیئے۔ اور جب خود اپنی دنائت سے شرم نہیں تو اس نہایت بعید آغاز نوع کی حیوانیت سے کیا خفت۔ کیا کوئی دانا آدمی ہزارہا برس پہلے جانوروں کو اپنا ہم قوم خیال کرنے سے شرما سکتا ہے۔ جبکہ آج بھی اس کے نوزائیدہ بیٹے میں اپنے ہم سن گھوڑے کے بچھیرے اور گائے کے بچھڑے کے برابر عقل نہیں۔ ہمارے خیال میں تو عقلمند شخص کو ان نامعلوم جانداروں کی اولاد ہونے سے انکار کرنا نہ چاہیئے جن میں تمام موجودہ اور گزشتہ جانوروں اور آدمیوں کی جسمانی اور روحانی طاقتیں مضمر تھیں۔ ان ہزاروں برس پہلے کے آباؤ اجداد کی پستی پر شرمندہ ہونے سے پہلے آدمی کو خود اپنے اعمال و افعال کو بےلوث بنانا بدرجہا بہتر اور ضروری ہے۔ جو بزرگ دو تین پشت دور ہو جاتے ہیں۔ ان کے کاروبار سے بھی ان کی اولاد کو سروکار یا ننگ و عار نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ ان پرانے آدمیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی پر ندامت اٹھائی جائے۔ جن کو قدرت نے اس وقت تک ان قوا سے سرفراز نہیں کیا تھا۔ جو آج ہمارے لئے مایۂ ناز ہیں۔ زمانہ بہت بڑا بھلانے والا ہے۔ بڑے سے بڑا غم اور سخت سے سخت رنج بھی چند دن یا چند مہینوں سے زیادہ نہیں رہتا۔ عالی شان جہاز اور سر بفلک پہاڑ جب دور ہوتے جاتے ہیں تو چھوٹے بھی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور آخر افق میں ایک دھبا سا رہ جا ہیں۔ قابل غور وہی امور ہیں جو خود ہماری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آدمی کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ خود اس کے اپنے حالات اور واقعات ہیں۔ اس کے بعد اس کی قوم اور اس کے خاندان کی وہ باتیں جن

Marfat.com

کے دیکھنے اور سننے والے اس کے سامنے موجود ہیں۔ اس سے بھی کم وہ واقعات عالم جو مورخ کی کوشش اور آثار قدیمہ کے متلاشی کی محنت سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان سب سے کم تعلق اس مضمون سے ہے جو ان ابتدائی لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے۔ جن کو گزرے ہوئے ہزاروں نسلیں اور سینکڑوں صدیاں گزر گئیں۔ جن کے حالات اتنے مختلف علوم و فنون کی طاقتور دوربینوں کی مدد سے بھی ایسے دھندلے اور مٹے مٹے نظر آتے ہیں جیسے کہ ہم اوپر کے بابوں میں دیکھ چکے ہیں۔ ان دور دراز کے رشتہ داروں کا بن مانس سے مشابہ ہونا کسی شخص کے خود بدمعاش یا اس کے دادا کے چور ہونے کی نسبت ہزاروں لاکھوں حصّے کم شرمناک اور باعث ننگ ہے ❖

مذکورہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دون حسبی کا اعتراض از رو سے عادت ہے۔ عقلاً صحیح نہیں ہے۔ سنتے سنتے اور کہتے کہتے ہر شخص کے دل میں یہ بات جم گئی ہے۔ مگر اس کی کچھ اصل نہیں۔ اگرچہ یہ خود داری کا خیال چنداں برا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کسی امر واقعی کی تردید نہیں کر سکتا۔ اور عقل صحیح اور واقعات حقیقی کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ انسان کی ابتدائی کیفیت کے متعلق ست جگ کا خیال بھی لوگوں کے دل میں بہت جما ہؤا ہے۔ اکثر قومیں تاریخی زمانے سے پہلے کی حالت کو بہت عمدہ اور پسندیدہ سمجھا کرتی تھیں۔ یونان اور روما کے شاعروں کو یہ مضمون بہت پسند تھا۔ وہ اس زمانے کی یاد میں گیت گایا کرتے تھے جس میں ان کے نزدیک آدمی بھی دیوتاؤں سے کچھ کم نہ تھے۔ ان کے قدوقامت نور و طاقت۔ پاکبازی و صداقت اور امن و راحت غرض سب باتیں ان لوگوں کے نزدیک قابل رشک تھیں۔ ان کی زندگی گویا جنت میں گزرتی تھی۔ دن کو سرسبز جنگلوں اور سدا بہار گلزاروں میں قدرت کے دل ربا منظر دیکھتے تھے۔ رات کو ایک جگہ بیٹھ کر حکمت اور عقلمندی کی باتوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے تھے۔ یہ دل کش سماں اکثر یونانیوں اور رومیوں کے دل کو گدگدایا

کرتا تھا۔ اور ان کو اس ابتدائی خوشحالی کا وقت یاد دلایا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال بہت پرانا تھا۔ اور اسی زمانے میں دل نشین ہو چکا تھا جب تمام آریا نسلیں یکجا رہتی تھیں۔ اور یونانی اور رومی رومی نہ بنے تھے۔ قومی مہاجرت میں اور چیزوں کے ساتھ ست جگ کا اعتقاد بھی یورپ میں ایشیا کی طرف سے آیا۔ اور رومۃ الکبرے کی عالیشان فتوحات کے سبب سے تمام عالم میں شائع ہو گیا۔ جب مسیحیت کا زور ہوا تو باغ عدن اور ابتدائے آدم کا قصہ مذہبی پیرائے میں آکر اور بھی زیادہ ذہن نشین ہو گیا۔ اور نئے مذہب کی روز افزوں پراگندگی سے آغاز آفرینش کے آرام آسائش کا خیال بھی پھیلتا گیا۔ قرون مظلمہ کی قابل افسوس ظلمت اور ظلم سے اس خیال کی اور بھی تائید اور تاکید ہوئی۔ ان دنوں ہر چیز روبزوال معلوم ہوتی تھی روما کی سلطنت کمزور ہو کر ٹوٹ چکی تھی۔ وحشیوں کا زور زورہ تھا۔ ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ تمدن اور معاشرت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ تمام یورپ پر تاریکی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ تنزل انسانی کا خیال پھیل گیا۔ جس سے رہی سہی امید ٹوٹ گئی اور بچے کھچے حوصلے پست ہو گئے۔ قیامت کی تصویر سب کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اور سب لوگ راضی برضا اور آمادۂ قضا ہو گئے ✤

یہ مایوسی کا چھلاوہ مسیحیت کی کئی ابتدائی صدیوں تک لوگوں کو ڈراتا رہا آدمی اس ابتدائی حالت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور موجودہ گردش ایام اور مصائب و آلام کے مقابلے میں ابتدائی وطن باغ عدن کی تصویر اور بھی دل کش اور خوشنما معلوم ہوتی تھی ؎

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود ✤ آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

ان تمام مختلف حالات و خیالات سے لوگوں کے دلوں میں ابتدائی ست جگ کا عقیدہ اور مابعد کی ترقی معکوس کا اعتقاد اچھی طرح راسخ اور مستحکم ہو گیا۔ آخر صدیوں بعد جب قرون وسطیٰ کے خواب گراں سے آنکھ کھلی اور دیکھا کہ ابھی تک نسل انسان فنا نہیں ہوئی۔ اور قیامت نہیں آئی۔ اور ساتھ ہی ترقی کے

Marfat.com

آثار نمایاں ہوئے تو پرانے اعتقادات اور نئے خیالات میں کشاکش ہستی کی ابتدا ہوئی۔ یورپ میں جہاں نئی تحقیقات نے جنم لیا تھا وہاں علمائے ملت نے ہر بات کو مذہبی تقدس اور دینی بزرگی کا لباس پہنا رکھا تھا یا ابتدائے آفرینش کے لئے کتاب پیدائش کا بیان منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ اور جو اس کے لغوی معنوں کی مخالفت کرتا تھا۔ وہ گویا خدا کا دشمن اور قابل گردن زدنی تھا۔ علوم طبعیات کے تمام شعبے اسی بلا میں مبتلا تھے۔ لوگوں کا ایمان تھا کہ کرۂ ارض کائنات کا مرکز اور سورج اور تمام سیارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اس کے خلاف کہنا زمین و آسمان کو زیر و زبر کرنا تھا۔ اس طرح علم ہئیت کی بنیاد ہی توڑ دی گئی۔ کتاب پیدائش میں دنیا و مافیہا کی پیدائش کے لئے چھ دن ٹھہرائے تھے۔ علم طبقات الارض کی تحقیقات جس سے زمین کی باترتیب آفرینش کے لئے کروڑہا کروڑ برس کی ضرورت تھی۔ کتاب انجیل کے جواب میں کتاب دجال سمجھی گئی۔ اور تمام دنیا کو بد دین اور بے ایمان بنانے کی ایک ترکیب خیال کی گئی۔ اور جب دلائل عقلی سے کام چلتا نظر نہ آیا تو آتش و تیغ سے کام لیا گیا۔ اور ہزاروں محقق ناکردہ گناہ عقل انسانی کو ترقی دینے کے جرم میں جیتے جی جلا دئے گئے یا سولی پر چڑھا دئے گئے۔ ؎

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست ✤ تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

یہ ظلم و ستم علوم ہئیت اور طبقات الارض سے ہی مخصوص نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک نئے علم و فن سے یہی سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ فن تشریح اور علم طب بھی مایۂ کفر اور باعث قتل بن گئے۔ اور یہ سب کچھ محض اسلئے کہ یہ علوم ان ہزارہا برس پہلے کے بزرگوں کے پرانے قصوں اور افسانوں کے لفظی ترجمے سے کسیقدر مختلف تھے۔

مسئلہ ارتقا کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے ان تمام باتوں کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ مسئلہ بہت سے قدیمی عقیدوں کے نزدیک قابل نفرت اور لائق نفریں ہے۔ مگر چونکہ یہ عقیدے صرف وضعی اور نقلی ہیں عقلی و اصلی اور حقیقی و واقعی نہیں۔ اس لئے آثار

حیات کے اس زیادہ صحیح مسئلے کے مقابلے میں قابل وقعت نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کوپرنکس کی ریاضی اور گلیلیو کی دوربین کے سامنے گردش آفتاب کا عقیدہ نہیں جم سکتا۔ جس طرح علم طبقات الارض کی باقاعدہ اور عالمانہ تحقیق کے سامنے کائنات کی خلقت شش روزہ کا خیال صحیح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ست جُگ کا موہوم گمان تاریخ کی اس تمام با اصول اور دقیق تحقیق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا جس سے ابتدائی انسانوں کی جانورانہ حالت اور وحشیانہ معاشرت کا صاف اور یقینی سراغ ملتا ہے۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ دونوں فریقوں میں وجہ مخالفت اصل واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ محض طرز عمل ہے۔ آثار حیات کی ابتدا کبھی نہ کبھی۔ کہیں نہ کہیں۔ اور کسی نہ کسی طرح ہوئی اور ضرور ہوئی دنیا ہمیشہ سے آباد نہ تھی۔ زندگی کی ابتدا کی گئی اور اب اس کی نمایاں ترقی محتاج بیان نہیں ہے۔ اس لئے کلام صرف اس بات میں ہو سکتا ہے کہ یہ زندگی کی ابتدا کب ہوئی۔ کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی؟ آیا یکایک ہوگئی یا رفتہ رفتہ ہوئی اس امر میں بحث نہیں ہے کہ ہوئی بھی یا نہیں ہوئی۔ واقعے کی واقعیت مابہ خلاف نہیں ہے۔ کیفیت وجہ نفاق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں فرقوں کا فرق خواہ نخواہ اتنا بڑھا دیا گیا ہے۔ انسان کی طبیعت میں قدرت نے تلاش اسباب کی زبردست خواہش رکھی ہے۔ جو منجملہ اور باتوں کے طرز آفرینش کو بھی معلوم کرنا چاہتی ہے۔ دل حتے الامکان اس کے متعلق مفصل واقفیت چاہتا ہے۔ اور جب تک تذبذب ہے۔ تب تک تردد بھی ہے۔ تفکر بھی ہے۔ تشویش بھی۔ بالخصوص زیادہ زور آفرینش انواع پر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ طبعاً پہلے آفرینش افراد کی چھان بین کرنی چاہئے تھی۔ مگر مباحثین نے اس موٹی بات کو نظرانداز کر دیا۔ نہایت عجیب بات ہے کہ ہزاروں برس پہلے کی ابتدائے انواع پر تو غور کیا جائے۔ اور روزمرہ کی پیش افتادہ ابتدائے افراد کو چھوڑ دیا جائے۔

ابتدائے افراد کے بارے میں ارتقا کا مسئلہ اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اس میں اعتراض کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کرہ زمین کی آفرینش کے متعلق بھی

اثبات واجب الوجود

یہ کتاب بھی مفتی محمدؐ انوار الحق صاحب کی ہی ترتیب دی ہوئی ہے۔ اس میں بہت سے مضامین انگریزی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہستی باری تعالےٰ کے مسئلے پر محض عقلی پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ اور صرف عام فہم عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ کہ نظام کائنات میں ایک ذیعقل حاکم علے الاطلاق کا وجود ضروری ہے۔ اور انسان جب تک اپنے آپ کو حیوان لایعقل نہ فرض کرے۔ تب تک اُسے خدا کے ماننے سے مفر نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہستی واجب الوجود کا مسئلہ تمام مذاہب عالم کا اصل اصول اور تمام نیکیوں کی بنا ہے اور آج کل جبکہ سائنس کی ترقی لوگوں کو الحاد اور مادہ پرستی کی جانب لئے جا رہی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے جادۂ عقل و قیاس سے ایک قدم بھی تجاوز نہیں کیا۔ اور عقلی مسائل کے سوا اور کسی دلیل کو قابل تسلیم نہیں مانا۔ لیکن پھر بھی اس نے دکھایا ہے کہ عقل سلیم خواہ نخواہ انسان کو توحید کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب عام دلچسپی کے سوا اہلِ اسلام کے لئے خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ چھپائی کی بابت صرف اس قدر کہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان کے عمدہ ترین پریس مفید عام آگرہ میں چھپی ہے۔ اور ۱۸×۲۲ نہایت عمدہ ولایتی کاغذ ہے۔ یہ کتاب جناب مفتی محمدؐ انوار الحق صاحب ایم۔ اے۔ انڈر چیف سکرٹری تاج محل بھوپال یا المشتہر سے بقیمت عمہ مِل سکتی ہے۔ تاجران کتب اور بہت سی کتابوں کے خرید نے والوں سے خاص رعایت کی جاویگی جو خط و کتابت سے فیصلہ ہوسکتی ہے

المشتہر

مفتی محمدؐ ابرار الحق۔ تاج محل۔ بھوپال۔

حیات کے اس [illegible] ان دونوں انتہائی باتوں کے وسط
میں آغاز انواع اور پیدائش انسان کا سوال ہے۔ علمائے سائنس کے نزدیک
ارتقا کا مسئلہ اس کے حل کرنے کے لئے بھی کافی وشافی ہے۔ لیکن اگر
موجودہ علم انسانی کی رو سے ہم اس مسئلے کو آثار حیات کے تمام اختلاف و انقلاب
کا مفسّر اور مشرّح تسلیم نہ بھی کریں تو ساتھ ہی اس مسئلے کو غلط ٹھہرانا۔ یا
ابتدائے افراد و انواع کو اس کے سوا کسی اور اصول کے مطابق قرار دینا بھی
ممکن نہیں ہے۔ انسانی طبیعت خود ہی آہستہ آہستہ صداقت کو تسلیم
کرتی جاتی ہے۔ اور راستی کی مخالفت خود ہی رفتہ رفتہ مٹتی جاتی ہے۔ ہم نے
مذکورۂ بالا مضمون میں دونوں فریقوں کی رائیں اور ان کے فرق واضح کر دئے
ہیں۔ ہم نہ تقلید اور قدامت پرستی کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ نہ الحاد اور مادہ پرستی
کے مجرم ٹھہر سکتے ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے صدق نیّت اور جوش صداقت سے لکھا ہے
واجب الوجود کی خلّاقی طاقت اور صناعی قدرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔
ذرّہ سے آفتاب تک اور ماہ سے ماہی تک اس کے نور کا ظہور ہے۔ لیکن
ساتھ ہی ارتقا کے مسئلے کی بھی تردید نہیں ہو سکتی۔ جو اسی خالق حقیقی اور
صانع واقعی کی شان ہر انسان اور حیوان میں دکھاتا ہے۔ اور اس مالک الملک
کے نہایت باترتیب آئین اور نہایت باضابطہ قوانین انسان ضعیف البنیان
کو سمجھاتا بتلاتا ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ
وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ +

تمام شد

Marfat.com